پرکاشکا - ۵۳

دیوانِ غالب

مرتبہ:

عبدالحق

About the Editor

Professor Abdul Haq is an eminent scholar and an authority of Urdu language, literature and culture. He was Professor and Head of Urdu Department in Delhi University. He served for ten years as President of All India Urdu Teachers' Association. Prof. Haq is associated with a number of universities and reputed institutions in India as a member of academic bodies, advisory committees and committees of courses. He has lectured as Visiting Professor in several universities all over India besides being invited to numerous countries abroad. The scholar has edited and authored more than fifty books. More than hundred research papers of Dr. Abdul Haq have been published and enriched the discipline of Urdu literature. These have been widely acclaimed by scholarly world. Among his important publications, mention may be made of Iqbal ke Ibtaidai Afkar, Asri Lughat, Iqbal aur Iqbaliat, Rasheed Ahmad Siddiqi, Iqbal Shaire Rangeen Nawa, Diwan-e-Hatim.

Professor Haq has received several state and national level honours and awards including Delhi Urdu Academy Award for Research Contribution in Urdu. He has been honoured as Professor Emeritus and Distinguished Service Award by the University of Delhi. He has received the most prestigious life time achievement award from the Delhi Urdu Academy, Govt. of Delhi and has been recently honoured by Iqbal Samman Award by the West Bengal Urdu Academy, Govt. of West Bengal on 20th May 2017.

دیوانِ غالب

پرکاشیکا نمبر ۵۳

جنرل ایڈیٹر

پرتاپ نند جھا

دیوان غالب

اہم خطی نسخہ کی عکسی اشاعت

مرتبہ

عبدالحق

نیشنل مشن فار مینسکرپٹس، نئی دہلی

اصیلہ آفسیٹ پرنٹرس، نئی دہلی

عرضِ حال

اقبال نشاطِ کار کی ہوس میں متواتر اضافے کے محرک بھی ہیں۔انہوں نے مجھے مختلف موضوعات کے مطالعہ کے لیے موقع فراہم کیے ہیں وہ مشرق ومغرب کے جہانِ جدید وقدیم کے ساتھ عالمِ نازاد کی نگہ داری کی بھرپور بصیرت بھی بخشتے ہیں۔انہیں کے وسیلے سے ناچیز رومی وحافظ یانظیری وغالب سے روشناس ہوا۔راقم کا یقین ہے کہ کلامِ اقبال میں رومی کے بعدسب سے زیادہ غالب کے حوالے ہیں۔رومی پر غالب جیسی کوئی مربوط نظم بھی نہیں ہے۔ تفکیری تناظر میں اقبال کو غالب سے برائے نام قربت بے سبب نہیں۔راقم کو اقبال کے توسط سے ہی غالب کو پڑھنے کی تشویق ہوئی۔اسی شوق کے طفیل اس قلمی نسخے کی اشاعت پر توجہ ہوئی۔یہ خطی نسخہ ۱۹۷۵ء سے میری تحویل میں ہے، میری محرومی تھی کہ اب تک متوجہ نہ ہوسکا۔اس میں شائبۂ تقدیر کے ساتھ میری بے سوادی اور کم نگہی کو بھی دخل ہے۔ غالب شناسوں کی بلند قامتی کے روبرو اپنے قد کی کوتاہی پر شرمسار ہوتا رہا۔مگر اب مطمئن ہوں کہ ناچیز کو اس نسبت پر ناز ہے کیوں کہ انہوں نے ہمارے شعری سرمایہ میں تفکیر وتدبر کی طرح ڈالی۔صاحب نظر کو بزرگوں کی کہنہ روایت سے پرہیز لازم قرار دیا۔مستعار ارض وسما کو مسمار کر کے ایک نئی دنیا آباد کرنے کا اعلان کیا۔شمعِ ماتم خانہ کو برق سے روشن کرنے کی آرزو کی۔خونِ گرم دہقاں اور بالِ جبریل کی بلند پروازی کی بات ہے۔وہ قطرۂ شبنم کی جرأت مندی کے منتظر ہیں جو وجود کو معدوم کردینے والی خورشید تاباں کی تپش کو جانتے ہوئے اس سے آنکھیں ملانے کی ہمت رکھتی ہے۔ غالب خرمن اور کھیتی کو برق وباراں کے سپرد کرنے کا حوصلہ بخشتے ہیں۔غالب کے یہاں نائے ونوش اور نغمہ ونشاط کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔

عبدالحق

مقدمہ

غالب فنی عظمتوں کے حیرت فروز شاعر ہیں۔ ان کے دیوان کو الہامی طاق پر سجا کر شاید ہم انتقادی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو گئے۔ غالب کا مطالبہ کچھ اور ہے۔ وہ اپنے دیوان کو دنیائے سخن کا دستور تسلیم کرتے ہیں اپنی شخصیت کے بارے میں غلو سے بھی گریز نہیں کرتے۔ وہ خود کو لوحِ رازی کا راز دار اور عربی و فارسی کی سخنوری کے چمن زار کا بلبلِ نا آفریدہ کہتے ہیں۔ وہ نغمہ ہائے صد رنگ کی آتش نوائی کے اسرار سے باخبر بھی ہیں۔

غالب ذولسان شاعر ہیں۔ فارسی و اردو میں ان کا ایک گراں مایہ ذخیرہ موجود ہے۔ اردو کلام کو ترتیب دیتے وقت انتخاب و اصلاح سے کام لیا۔ ایک معقول حصہ کلام حذف کر دیا۔ دیوان مختلف وقفوں میں شائع ہوتا رہا۔ ان کی مقبولیت دیکھئے کہ ان کی حیات میں دیوان پانچ یا چھ بار شائع ہوا۔ بار بار کی اشاعتوں میں نظرِ ثانی ہوتی رہی۔ اصلاح و اضافہ سے متن کا تبدیل ہونا ایک فطری عمل تھا۔

کلامِ غالب کو ان کے دور میں قدر کی نظر سے دیکھا گیا۔ انتقال کے بعد اس کی مقبولیت میں حیرت انگیز اضافہ ہوا۔ انیسویں صدی کے کسی شاعر کا کلام فن کار کی زندگی میں پانچ بار شائع نہ ہو سکا۔ یہ شرف غالب کے اردو دیوان کو حاصل ہے۔ غالب نے پچیس سال کی عمر میں (۱۸۲۱ء) اردو کلام مرتب کر لیا تھا۔ لیکن اردو دیوان مطبع سید الاخبار دہلی سے ۱۸۴۱ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ تقریباً چھ سال بعد (۱۸۴۷ء) میں اس کا دوسرا نقش مطبع دار السلام دہلی اور ۱۸۶۱ء میں تیسری بار مطبع احمدی دہلی سے شائع ہوا۔ یہ تینوں اشاعتیں دہلی اور غالب کی نگرانی میں منظرِ عام پر آئیں۔ مطبع نظامی کان پور نے چوتھا ایڈیشن شائع کیا۔ آگرہ کے منشی شیونرائن کی نگرانی میں پانچویں بار ۱۸۶۳ء میں دیوان طبع ہوا۔ ۱۸۲۱ء سے لے کر پانچویں اشاعت تک کلام میں ترمیم و اضافے

ہوتے رہے۔ یہ ایک فطری عمل تھا کیوں کہ فن کار کی تخلیق میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ۱۸۲۱ء سے ۱۸۶۳ء کے درمیان تقریباً چالیس سال کا وقفہ ہے۔ دیوان کے تمام نسخوں میں نسخۂ حمیدیہ کو بڑا اعتبار حاصل ہے۔ کیوں کہ اس میں متداول کلام کے ساتھ منسوخ کلام بھی شامل ہے۔ ایک طرح سے یہ مکمل دیوان غالب ہے، جس میں تقریباً ساڑھے سولہ سو اشعار درج ہیں۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے ۱۹۱۸ء میں حمیدیہ لائبریری بھوپال سے اس نسخے کو حاصل کیا تھا، جسے اس وقت کے مشیر تعلیم ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کو پیش کیا گیا۔ انھوں نے اسی نسخے کی اشاعت کے لیے اپنا گراں قدر مقدمہ لکھا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد مفتی محمد انوار الحق کی سرپرستی میں اس نسخہ کی ۱۹۲۱ء میں اشاعت ہوئی۔ ڈاکٹر بجنوری کا مقدمہ مولوی عبدالحق نے ۱۹۲۱ء میں انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع کیا تھا۔ وہ مقدمہ دیوان کا حصہ نہ بن سکا، الگ کتابی صورت میں شائع ہوتا رہا ہے۔

اردو کے مقابلہ ان کا فارسی سرمایۂ سخن کہیں زیادہ ہے۔ فارسی کلیات اردو دیوان کے چند سال بعد شائع ہوا۔ کلکتہ کے سفر (۱۸۲۷ء) سے واپسی پر غالب نے فارسی کلیات کی جمع و ترتیب پر توجہ دی۔ اس کا نام 'میخانۂ آرزو سرانجام' رکھا۔ اس کی تکمیل و اشاعت میں کئی سال صرف ہوئے۔ کلیات فارسی کا پہلا نقش ۱۸۴۵ء میں مطبع دارالسلام دہلی سے شائع ہوا۔ غالب کے تجویز کردہ نام سے الگ 'دیوان فارسی افصح الفصحا ابلغ البلغاء' کی عبارت سرورق پر موجود ہے۔ بعد ازاں اس کا دوسرا ایڈیشن منشی نول کشور نے لکھنؤ سے ۱۸۶۳ء میں شائع کیا۔ اس اشاعت میں اشعار کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے، کیوں کہ پہلی اشاعت سے ۱۸۶۲ء تک جو کلام تخلیق ہوا کم و بیش اس میں شامل کرلیا گیا۔ فارسی کلیات کے دو اہم مخطوطے خدا بخش لائبریری پٹنہ اور انجمن ترقی اردو کراچی کے ذخیرے میں محفوظ ہیں۔ اردو دیوان کے چند خطی نسخے بھی موجود ہیں۔ چند برس پہلے نسخۂ امروہہ کی بازیافت اور استناد پر خیال افروز علمی بحث شروع ہوئی۔

تحقیق میں خطی نسخوں کی دریافت اور ان کا استناد ایک سنگین مسئلہ ہے۔ اگر فن کار کا تیار کردہ یا اصلاح کردہ نسخہ موجود نہیں ہے تو مسائل اور بھی پیچیدہ ہوجاتے ہیں۔ تدوین کی راہیں مسدود و مشتبہ ہوجاتی ہیں۔ غالب کی زندگی میں ان کا کلام شائع ہوتا رہا۔ اس لیے دیوان کی ترتیب و تدوین میں مشکلات کم سے کم ہیں۔ مگر بار بار کی اشاعتوں سے متون میں معمولی فرق کا

آجانا ایک فطری اور غیر شعوری عمل ہوتا ہے۔ خود قلم کار کے ہاتھوں سے تبدیلی بھی ایک آزمائش ہوتی ہے۔

غالب اور اردو دونوں کی خوش نصیبی ہے کہ کلام غالب کے متعدد قلمی نسخے موجود ہیں۔ یوں بھی غالب کو گزرے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے۔ مزید یہ کہ ان کی حیات میں انھوں نے خود ہی کلام مرتب کر دیا تھا۔ اس ترتیب کے وقت انھوں نے کلام کا ایک حصہ حذف کر کے انتخاب کو ترجیح دی تھی۔ یہ ان کی انتقادی نظر کی بات تھی۔ غالب شناسوں نے حسبِ ذیل قلمی نسخوں کی نشان دہی کی ہے۔

نسخۂ بھوپال ۱۲۳۷ھ یعنی ۱۸۲۱ء میں مکمل ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا کلام نسخۂ حمیدیہ میں شامل ہے۔ اصل نسخہ محفوظ نہیں ہے۔ چند دنوں پہلے اس کے موجود ہونے کی خبر آئی ہے۔ نسخۂ امروہہ ۱۲۳۱ھ کی یادگار ہے۔ بخطِ غالب ہونے کے سلسلے میں اہلِ علم کی مختلف رائیں ہیں۔ برصغیر میں اس نسخے کے اصلی و جعلی ہونے کے سلسلے میں بڑی بحث ہوئی اور ابھی تک یہ مخطوطہ مستحکم استناد کا منتظر ہے۔ نسخۂ شیرانی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ نسخۂ بھوپال کا مبیضہ ہے۔ یہ ۱۲۴۳ھ (۱۸۲۶ء) میں تیار کیا گیا۔ گلِ رعنا کی کتابت ۱۸۲۸ء اور ۱۸۲۹ء کے درمیان مکمل ہوئی۔ نسخۂ رام پور ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۳ء) میں تیار ہوا۔ نسخۂ بدایوں ۱۸۳۵ء کا لکھا ہوا ہے۔ کراچی کا نسخۂ دیوانِ غالب ۱۸۴۵ء کا بتایا جاتا ہے۔ نسخۂ لاہور ۱۸۵۶ء میں رقم کیا گیا۔ رام پور کے ایک اور نسخے کی نشان دہی کی جاتی ہے جو ۱۸۵۵ء میں لکھا گیا۔ ایک اور مخطوطہ ہے جو نسخۂ طاہر کے نام سے منسوب ہے۔ یہ ۱۸۶۰ء کا مرقومہ ہے۔

ایک اور متنازع مخطوطہ کا ذکر مناسب ہوگا، جسے ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ انھوں نے دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ (خواجہ منظور الحسن) کو ۲۰۰۰ء میں لاہور سے شائع کیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ نسخۂ لاہور ہی ہے، جس کا تعارف ڈاکٹر سید عبداللہ کرا چکے تھے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی اور ڈاکٹر سید معین الرحمٰن میں ٹھن گئی۔ اس بحث کے طفیل کئی اور تصانیف شائع ہوئیں۔ غالب شناس دو صفوں میں زور آزما ہوئے۔ سطحی اور شخصی تنقید سے دیوان کا وقار مجروح ہوا۔ ہندوستان میں نسخۂ امروہہ پر بھی ہنگامہ ہوا۔ ایوان بالا تک بات پہنچی تھی مگر غالبیات

میں اضافہ ہوا۔ دونسخوں کی اشاعت اوران پر جاری بحث سے غالب شناسی کو ایک جہت ملی اور شہرت بھی۔

مذکورہ نسخوں کی نشان دہی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کے حینِ حیات میں دیوان کی اشاعتوں کے ساتھ خطی نسخوں کی نقل وکتابت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔اس سے کلام غالب سے گرویدگی اورشہرتِ عام کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔راقم کی محرومی ہے کہ کلامِ غالب کے مذکورہ کسی خطی نسخہ تک رسائی نہ ہو سکی۔تقریباً تیس سال قبل زیرِ مطالعہ نسخہ مجھے حاصل ہوا۔عدم دلچسپی کی بنا پر اس پر توجہ نہ دے سکا۔ایک سبب یہ بھی تھا کہ یہ نسخہ وفاتِ غالب کے بعد کا لکھا ہوا ہے اور متداول دیوان سے مختلف بھی نہیں ہے اور نہ ہی اس میں کوئی اضافہ ہے۔اس وقفے میں ناچیز بالاستیعاب مطالعہ بھی نہ کر سکا۔غالب پر کبھی کبھار ضرورتاً یا فرمائشی مضامین کو مرتب کرتے وقت خیال آیا کہ کیوں نہ اس نسخے کا ایک سرسری تعارف پیش کیا جائے۔شاید کبھی کسی طالب علم کو آیندہ متوجہ ہونے کا موقع ملے۔مخطوطہ کے متن کی قرأت اور تقابل کے لیے میرے پیشِ نظر دیوانِ غالب کا صدی ایڈیشن ہے، جو بمبئی سے ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا تھا۔نسخۂ حمیدیہ کا اردو اکیڈمی لکھنؤ کا عکسی ایڈیشن سامنے ہے جو ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا تھا۔

ناچیز کے نزدیک اس نسخے کی تین اہمیت ہے جو قطعی طور پر انقلاب آفریں نہیں ہے اور نہ ہی یہ کوئی بہت بڑی دریافت ہے۔مخطوطات جیسے بھی ہوں ان کی گراں مائیگی سے گریز کم نگہی ہوگی اور کم نصیبی بھی۔علم وادب کے اثاثے کی قدردانی پر ہمیں نازاں ہونا چاہیے۔ان کی حرمت وحفاظت پر مرمٹنے کے لیے جان وتن کی پرواہ کیے بغیر ہر طرح کی آتش وآزمائش سے نبردآزما ہونے میں ہی جینے کا مزہ ہے۔

دیوانِ غالب کے معلوم شدہ قلمی نسخوں میں بس یہ ایک اضافہ ہے اور کسی نہ کسی حد تک اس کی اہمیت بھی ہے۔دوسرے یہ کہ غالب کی زندگی کا نہ سہی مگر یہ قریب ترین زمانے کا ہے۔میرا قیاس ہے اور ممکن ہے کہ غالب کی زندگی میں اس کی نقل وکتابت شروع ہوئی ہو۔خواہ کسی قلمی نسخہ یا مطبوعہ نسخوں کی مدد سے یہ تیار کیا گیا ہو۔کیوں کہ غالب کے انتقال سے تین ماہ بعد مخطوطہ مکمل ہوا۔ ۱۵رفروری اور ۲۵رمئی کے درمیان تین ماہ دس دن کا وقفہ ہے۔یہ نسخہ نواحِ دہلی کی یادگار ہے۔اس

میں ایک مکمل ترقیمہ ہے، جس میں ماہ وسال کے ساتھ اس نسخہ کی تیاری کا مقصد بھی مرقوم ہے، جس سے یہ شہادت برآمد ہوتی ہے کہ امراو رؤسا کی خدمت میں دیوانِ غالب کو پیش کرنے کی خواہش یا رسم بھی تھی۔ اس سے بزمِ خواص میں بھی غالب کی شاعری سے التفات کا پتہ چلتا ہے۔ غالبًا یہ پہلا نسخہ ہے جو کسی غیر مسلم صاحب شکوہ وشان کو نذر کیا گیا ہے۔ ملک وملت کے فرماں روا کو نہ سہی مگر صاحب رام جی ہنڈن کے صاحبِ حیثیت اور زمین وجائیداد کے مقتدر مالک تھے۔ ان سے قطعِ نظر اس دستی تحریر کی تیسری سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ عہدِ غالب کا اندازِ خط اس میں محفوظ ہے، جس سے خط کی ارتقائی صورتِ حال پر روشنی پڑتی ہے۔ تقریبًا پونے دو سو سال کے اسلوبِ تحریر پر مشتمل اردو رسمِ خط کا یہ ایک گراں مایہ دستاویز بھی ہے، جس سے املائی صورتوں میں جگہ جگہ فرق نظر آتا ہے، جس سے اس دور کے اندازِ خط کا پتہ چلتا ہے۔ اس زمانے کے مخطوطات میں یہ چلن عام ہے کہ پیش کی آواز کے لیے او کا بالالتزام استعمال ہے۔ اوٹھایا، اودھر، اوسے، اوسنے، اولٹے، اوس وغیرہ۔ زیر کے لیے ای کا استعمال ہے۔ ایدھر۔ دوسری آوازوں کے ساتھ بھی تحریر مختلف ہے۔ بڈھ کر، پڈھیے ای، ے کا فرق معدوم ہے۔ ک گ کی کشش میں یکسانیت ہے۔ سوچ کو سونچ لکھا گیا ہے۔ ایسے کئی اختلاف ہیں جو تحریر کے عام مزاج کی نشان دہی کرتے ہیں۔ لفظوں کو ملا کر لکھنا مزاج بن گیا تھا۔

ان سے زیادہ اہم مسئلہ متن میں معمولی اختلاف کا ہے، جو کہیں کہیں پایا جاتا ہے۔ یہ کاتب کے قلم کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ پیشِ نظر نسخہ کی بات ہے جس سے نقل کیا گیا ہے۔ مشہور غزل کے مطلع کے مصرع ثانی کا اختلاف ملاحظہ ہو:

قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا

متداول نسخوں میں 'سے' ہے، میں نہیں۔ نسخۂ حمیدیہ میں بھی 'سے' ہے۔

اسی غزل کے آخری شعر میں:

ہے نوآموز فنا ہمت دشوار پسند

عام طور پر مطبوعہ نسخوں میں 'ہے' کی جگہ 'تھی' ہے۔ نسخۂ حمیدیہ میں بھی 'تھی' لکھا ہے۔

نسخۂ حمیدیہ کی اس غزل میں دس اشعار ہیں، مگر مطبوعہ اور مخطوطہ میں کل پانچ شعر ہیں:

دوسری غزل میں مخطوطہ میں 'معاملہ' کی جگہ 'مقابلہ' لکھا ہوا ہے:

'تھا خواب میں خیال کو تجھ سے مقابلہ'

مخطوطہ اور حمیدیہ میں 'معاملہ' ہے۔

چوتھی غزل میں ہے:

'آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا'

حمیدیہ اور مطبوعہ صورت میں 'کو' کی جگہ 'میں' ہے۔

ایک دوسرے شعر میں سوتے کی جگہ سوئے درج ہے۔

بغل میں غیر کے آج آپ سوئے ہیں

ایک جگہ قرض کی جگہ مخطوطہ میں فرض درج ہے۔ عین ممکن ہے کہ سہو کاتب ہو۔ ایک اور مصرع میں 'سے' لکھا گیا ہے جب کہ مطبوعہ دیوان میں 'میں' ملتا ہے۔

ہاں ہجوم اشک سے تار نگہ نایاب تھا

حمیدیہ کا مصرع اس طرح ہے: 'ہاں ہجوم اشک سے تارِ نظر نایاب تھا'

مطبوعہ دیوان میں ہے: 'ہاں ہجومِ اشک میں تار نگہ نایاب تھا'

ایک اور جگہ: 'یاں ہجومِ اشک سے تارِ نظر نایاب تھا'

تین جگہ سے ہے: ،ز مطبوعہ صورت میں 'میں' ہے۔ دو جگہ تار نگہ اور دو جگہ تارِ نظر ہے۔

مخطوطہ کا ایک دوسرا مصرع ملاحظہ فرمائیں:

میں کہوں گا حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

حمیدیہ اور مطبوعہ دیوان میں 'ہم کہیں گے' ہے۔ بعد کے شعر کے مصرع اولیٰ میں 'آدیں' ہے، جب کہ مطبوعہ نسخوں میں 'آدیں' کی جگہ 'آئیں' ہیں۔

حضرت ناصح گر آدیں دیدہ ودل فرشِ راہ

غزل کے آخری شعر کے مصرع اولیٰ میں لفظ دیکھ سہواً رہ گیا ہے۔ مخطوطہ میں ایک جگہ 'جنوں' ہے جب کہ مطبوعہ دیوان میں 'مجنوں' ہے۔ مخطوطہ میں 'غلطیدن' ہے جب کہ مطبوعہ میں اس کا املا 'غلتیدن' نظر آتا ہے۔ یہاں کاتب نے غالب کی پیروی نہ کر کے جمہور کے طریقۂ املا کو

پسند کیا ہے، کیوں کہ غالب کو 'غلطیدن' لکھنا مناسب نہیں لگتا۔ وہ 'پنج آہنگ' میں لکھتے ہیں:

'غلتیدن، غلتید، غلتیدہ، غلتد، غلت، آشکار باد کہ نوشتن ایں بہ طائے حطی غلط است۔'[1]

اسی غزل کے مقطع میں 'حیرت سنج' ہے جب کہ مطبوعہ دیوان میں 'حسرت سنج' درج ہے۔ مخطوطہ میں جگہ جگہ 'یہاں' لکھا گیا ہے جب کہ مطبوعہ دیوان میں 'یاں' موجود ہے۔ یہاں یا وہاں لکھ کر یاں اور واں پڑھنے کا غالباً رواج تھا۔ مخطوطہ میں یہ صورت عام ہے:

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہائے گل

'ہ' کو حذف کر دیا گیا ہے۔ مشہور غزل:

'آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہوتے تک'

کا املا محفوظ ہے۔ ہونے تک نہیں ہے۔ اس قرأت پر سنجیدہ گفتگو بھی ہوتی رہی ہے۔ ایک مقطع میں 'تھے' رقم ہے جب کہ مطبوعہ دیوان میں 'ہیں' درج ہے:

کم جانتے تھے ہم بھی عشق کو پر اب

مخطوطہ کا متن زیادہ صحیح لگتا ہے۔ ایک غزل میں 'یہ' لفظ رہ گیا ہے جو سہو کاتب کا نتیجہ ہے:

تیرے وعدہ پر جیے ہم تو جان جھوٹ جانا

آخری غزل میں مخطوطہ میں 'کہنے' درج ہے۔ جب کہ مطبوعہ اور حمیدیہ میں 'گھسنے' لکھا ہوا ہے:

دل ہوا کش مکش چارۂ زحمت میں تمام
مٹ گیا کہنے میں اس عقدہ کا وا ہوجانا

اس غزل کے اشعار کی ترتیب میں ایک معمولی تبدیلی قابلِ توجہ ہے۔ مطبوعہ نسخوں میں مقطع کے بعد یہ شعر درج ہے:

تاکہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل
دیکھ برسات میں سبز آئینے کا ہوا جانا

مخطوطہ اور حمیدیہ میں یہ شعر مقطع سے پہلے ہے، جو صحیح لگتا ہے۔ اسی ردیف الف کی ایک

---

[1] پنج آہنگ، مرتبہ پروفیسر حنیف نقوی، پٹنہ، ۱۹۹۷ء، ص ۱۰۷

غزل کے مطلع میں 'آئیں' ہے، مطبوعہ میں 'آئے' ہے۔

جور سے باز آئیں پر بازآئیں کیا

ایک غزل میں 'ہوگا' ہے جب کہ مطبوعہ نسخوں میں بہ شمول حمیدیہ 'ہوتا' لکھا گیا ہے 'ہوگا' مناسب نہیں ہے۔

عرش سے ادھر ہوگا کاش کے مکاں اپنا

حمیدیہ میں 'ادھر' کی جگہ 'پرے' ہے۔ اس طرح سے نسخوں میں اختلاف کا ہونا صحیح تدوین کا مطالبہ کرتا ہے۔ 'طراز' کو مخطوطہ میں 'تراز' لکھا ہے جو کاتب کی کم سوادی نہیں بلکہ منشائے غالب کے مطابق ہے، کیوں کہ غالب باصرار اس املا کی تاکید کرتے اور خود بھی کاربند تھے۔ خطوط میں شاگردوں کو لکھتے رہے۔ میاں دادخاں سیاح کو لکھا ہے:

> "جس طرح عین فارسی میں نہیں ہے 'طوے' بھی نہیں ہے۔ مثلاً تشت لغت فارسی الاصل ہے۔ املا اس کی طوے سے غلط ہے۔"[1]

'پنج آہنگ' میں بھی یہ تاکید موجود ہے:

> 'ترازیدن، ترازید، ترازیدہ، ترازندہ، تراز املائے ایں بہ طائے حطی جائز نیست۔'[2]

غالب کا یہ اپنا خیال تھا، جس کی مخالفت حالی، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے کی ہے۔

مخطوطہ میں کاتب نے اگر طراز کو تراز لکھا ہے تو املائے غالب کے مطابق ہے۔ اس سے یقین ہوتا ہے کہ کاتب کے پیشِ نظر دیوان کا ایسا نسخہ قلمی یا مطبوعہ موجود تھا، جو املائے غالب کے مطابق تیار کیا گیا تھا۔ اس لیے کہ جمہور کا یہ طریقہ نہ تھا۔

ب ردیف کی غزل میں ایک شعر میں نقل کی ترتیب میں فرق ہے۔ مخطوطہ میں چوتھا شعر مطبوعہ میں چھٹا شعر ہے۔ آئیں اور آئے کا فرق بتایا جاچکا ہے۔ ایک اور غزل میں جائے ہے مطبوعہ دیوان میں جائیں ہے۔

---

[1] غالب کے خطوط (جلد دوم)، مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص ۵۵۴

[2] پنج آہنگ، مرتبہ پروفیسر حنیف نقوی، پٹنہ، ۱۹۹۷ء، ص ۱۰۵

جلاد کو لیکن وہ کہے جائے کہ ہاں اور

عارف کے مرثیہ میں شعر کی ترتیب میں فرق ہے۔ حمیدیہ اور مطبوعہ میں مقطع سے پہلے یہ شعر ہے:

گزری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش

جب کہ مخطوطہ میں مقطع سے پہلے یہ شعر ہے:

مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیر سے لڑائی

مخطوطہ کے کاتب کے پیشِ نگاہ جو نسخہ تھا۔ اس میں غالباً یہی ترتیب رہی ہوگی۔ ایک اور جگہ معمولی سا فرق نظر آتا ہے۔ مطبوعہ صورت میں 'لگائے' ہے۔ خطی نسخہ میں 'لگاوے' لکھا گیا ہے:

لگاوے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

حمیدیہ میں بھی 'لگاوے' ہے۔

باوجودِ یک جہاں ہنگامہ پیرائی نہیں

مطبوعہ کلام میں 'پیرائی' کی جگہ 'بیدائی' لکھا گیا ہے۔ ایک مصرع ہے:

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر

مخطوطہ میں عمر بھر کی جگہ رات بھر ہے۔ راقم کو یہ زیادہ بہتر لگتا ہے۔ ایک اور مشہور مصرع میں ایک لفظ کی تبدیلی کھٹکتی ہے:

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھیے تھمے

عام دیوان میں مخطوطہ کے برخلاف تھمے ہے اور یہی زباں زد بھی ہے۔ لیکن خطی نسخہ کی تبدیلی کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مخطوطہ میں مصرع اس طرح لکھا ہے:

مہر گردوں ہے چراغاں رہ گذارِ باد باں

مطبوعہ دیوان کا متن زیادہ بہتر لگتا ہے:

مہر گردوں ہے چراغ رہ گزارِ بادباں

یہاں غالب کے طرزِ املا کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ وہ تو 'ذ' کے سرے سے قائل ہی نہ تھے۔

اس پر بحث ہوتی رہی اور غالب اپنے موقف سے ہٹے نہیں۔ ہمارے تحقیقی اکابرین ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر نذیر احمد نے غالب سے اختلاف کیا ہے اور 'ذ' کو حرف تسلیم کیا۔

خطی نسخہ میں اس شعر کے بعد 'مطلعِ دیگر' جلی حرفوں میں لکھا ہے۔ جب کہ ایک نئی غزل شروع ہوتی ہے۔ اس غزل کا مشہور شعر ہے:

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے

مطبوعہ دیوان میں وہ 'آئیں' ہے۔ اس سے بہتر 'آئے' محسوس ہوتا ہے۔ ایک اور غزل کے متن میں معمولی فرق نظر آتا ہے:

رکھے ہے تو قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ

مطبوعہ دیوان میں 'رکھتے ہو' لکھا گیا ہے۔

اس غزل کے مقطع میں بھی کہ 'اور جو' کا فرق ہے۔ مملوکہ نسخے میں مصرع اس طرح ہے:

وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

مطبوعہ دیوان میں 'جو' ہے۔

ایک مصرع میں لفظوں کی ترتیب میں معمولی فرق ہے۔

مخطوطہ: میں گیا بھی واں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب

مطبوعہ: واں گیا بھی میں...

مخطوطہ میں مقطع کے بعد وہ شعر درج ہے جو مطبوعہ میں مقطع سے پہلے ہے:

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج

ایک اور فرق ملاحظہ ہو غیر کی جگہ کوئی ہے۔

مخطوطہ: بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں

حمیدیہ میں دونوں قرأت موجود ہے:

بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم غیر کوئی اٹھائے کیوں؟

اسی غزل کا ایک مصرعۂ ثانی ہے:

اپنے جو اعتماد پہ ہے غیر کو آزمائے کیوں

معنی کے اعتبار سے بہت مناسب لگتا ہے۔

ردیف 'ؤ' کی پہلی غزل میں 'خرامِ ناز آجائے' کی جگہ مخطوطہ میں 'خرام ناز آ باوے' ہے۔ ایک فرق قابلِ توجہ ہے:

مخطوطہ — تیرا جلوہ گاہ ہو

مطبوعہ — تری جلوہ گاہ ہو

مشہور غزل کا مصرعۂ ثانی میں ایک لفظ کا فرق ہے۔

مخطوطہ — سبک سر ہو کے کیا پوچھیں

حمیدیہ اور مطبوعہ — سبک سر بن کے کیا پوچھیں

مخطوطہ — کہ جب دل میں تمھیں تم ہو پھر آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

حمیدیہ اور مطبوعہ میں 'پھر' کی جگہ 'تو' ہے۔ پھر زیادہ موزوں لگتا ہے۔

حمیدیہ اور مخطوطہ — بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے

مطبوعہ میں 'بنایا' کہ جگہ 'بنانا' لکھا ہوا ہے۔ یہاں بھی راقم کو بنایا زیادہ فصیح لگتا ہے۔

مخطوطہ میں ایک مقطع میں 'سے' لکھنا رہ گیا ہے۔ ایک جگہ اور 'ہوئی' کو 'ہے' لکھا گیا ہے، جو غلط ہے۔ ایک اور جگہ 'تھی' لکھنے سے رہ گیا ہے۔ تعجب ہے کہ کاتب نے ایک محترم شخصیت کو پیش کیے جانے والے نسخے کو بے احتیاطی سے نقل کیا ہے۔ اسی غزل میں ایک شعر کی ترتیب بدل گئی ہے۔

مری ہستی فضائے حسرت آباد تمنا ہے

ہوسکتا ہے کہ یہ حیرت ہی ہو، کاتب نقطے لگانا بھول گیا ہو۔ کیوں کہ حمیدیہ اور مطبوعہ صورت میں حیرت ہی ہے۔ اگر چہ حسرت بھی فصیح ہے۔ غالب کے اسالیب فکر میں حسرت کا اکثر ذکر ملتا ہے۔ مخطوطہ میں مشہور غزل کا مصرع ہے:

ہم بھی کیا یاد رکھیں گے کہ خدا رکھتے تھے

حاشیہ پر 'کریں گے' لکھ کر اسے درست کیا گیا ہے۔ مطبوعہ صورت میں کریں گے ہی ہے۔ ایک مصرع میں 'مانا' کی جگہ مخطوطہ میں 'جانا' لکھا ہے۔

جانا کہ اک بزرگ کہیں ہم سفر ملے

یہی قرأت حمیدیہ میں بھی ہے۔ اس سے قلمی نسخے کی معنویت اور اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

ایک مصرع میں لفظوں کی ترتیب میں فرق ہے۔

مخطوطہ دیکھتا ہے دے کے خط منہ نامہ بر

مطبوعہ دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر

مخطوطہ عجب نشاط سے جلاد کے چلیں ہیں ہم آگے

مطبوعہ میں 'چلیں' کی جگہ 'چلے' ہے۔

اسی غزل کے ایک دوسرے شعر میں 'اوٹھائیں' ہے جب کہ مطبوعہ میں 'اٹھائی' ہے۔

ایک مقطع میں 'ہمت' رندانہ چاہیے کی کتابت ہے۔ مگر غلطی کو حاشیہ میں 'جرأت' لکھ کر درست کیا گیا ہے۔

سترہ اشعار پر مشتمل طویل غزل ہے۔ ایک شعر کے مصرعہ ثانی کے متن میں معمولی فرق نظر آتا ہے۔ مخطوطہ زیر مطالعہ میں اسی طرح ہے:

نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے

حیرت ہے کہ حمیدیہ میں بھی نظارہ وخیال ہی ہے۔ گویا ابتدائی شکل یہی تھی۔

مطبوعہ صورت 'سازِ چمن خیال کا ساماں کیے ہوئے' ہے۔

ایک مقطع میں 'ہیں' لکھا گیا ہے۔ حمیدیہ اور مطبوعہ دیوان میں 'ہے' رقم ہے۔

ہیں جن کے آگے سیم و زر و مہر و ماہ باند

'ے' کی ردیف میں پہلی غزل کے آخری شعر میں 'آجاوے' ہے۔ مطبوعہ صورت میں 'آئے' ہی لکھا گیا ہے:

اگر وہ سرو قد گرمِ خرامِ ناز آجاوے

اسی ردیف میں ایک اور جگہ سو بار ابر 'آوے' ہے جب کہ مطبوعہ میں 'آئے' ہے۔ کاتب سے ایک اور جگہ غلطی ہوئی ہے۔ ملے کو مرے لکھا ہے۔

کہ مرے عدو کو یارب مرے میری زندگانی

گیارہ اشعار کی پوری غزل میں آئے کی جگہ آوے ہی ردیف ہے:

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے

جاں کالبد صورتِ دیوار میں آوے

یہی صورت حمیدیہ میں بھی ہے۔ حمیدیہ میں ایک اور غزل کی قرأت آوے ہے:

قتلِ عشاق نہ غفلت کش تدبیر میں آوے

لگتا ہے کہ اس دور میں 'آوے' اور 'آئے' میں فرق معدوم تھا۔ نقل کرتے وقت مشہور شعر میں لفظ کی نہیں لکھا گیا ہے۔ اسی مصرع میں 'صلے' کی جگہ 'صلا' لکھا ہوا ہے۔

نہ ستایش (کی) تمنا نہ صلا کی پروا

اسی ردیف میں ایک مصرع ہے:

دل خوش گریہ میں ہے ڈوبی ہے اسامی

مطبوعہ صورت میں ڈوبی ہوئی موجود ہے۔ حمیدیہ میں یہ شعر نہیں ہے۔

غزل کا شعر ہے:

اے تیرا غمزہ یک قلم انگیز

اے ترا ظلم سر بسر انداز

مخطوطہ اور عام مطبوعات میں یہی متن ہے۔ نسخۂ حمیدیہ میں 'غمزہ' کی جگہ جلوہ اور 'غمزہ' دونوں ہیں اور آخری شعر کے مصرعۂ اولیٰ میں بھی دونوں صورتیں موجود ہیں:

نگہِ التفات سوئے اسد

مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا ‏ ‏ ‏ میں غریب اور تو غریب نواز

مخطوطہ اور متداول میں 'مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا'

اصلاح شدہ شکل کو ترجیح دی گئی ہے۔ یہی ہمارے لیے مستند ہے اور معتبر بھی، کیوں کہ تدوینِ متن کا تسلیم شدہ اصول ہے کہ فن کار کے قلم کا اصلاح شدہ متن ہی صحیح اور قابلِ قبول ہے۔

ردیف کاف عربی میں بھی یہی اختلاف موجود ہے۔ اس ردیف کی پہلی غزل کا مطلع ہے:

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلان بے پروا نمک

کیا مزہ ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

نسخۂ حمیدیہ میں پہلے مصرع کی موجودگی کے ساتھ ایک اور متن بھی دیا گیا ہے:

زخم پر باندھے ہیں کب طفلان بے پروا نمک

حمیدیہ میں گیارہ اور مطبوعہ و مخطوطہ میں نو اشعار ہیں۔ حمیدیہ میں ایک زائد شعر میں اسد تخلص بھی ہے۔ نسخۂ حمیدیہ کا یہ متن ہمارے مطالعہ میں شامل نہیں ہے۔ قلمی نسخہ ہی پیش نگاہ ہے۔ اختلاف کی نشان دہی کے لیے مختلف متون کو تقابل کے لیے زیر بحث لایا گیا ہے۔

مشہور قصیدہ 'صبح دم دروازۂ خاور کھلا' کے ایک شعر کے مصرعۂ اولیٰ میں مخطوطہ اور حمیدیہ میں متن ایک جیسا ہے۔ مطبوعہ دیوان میں ذرا سا فرق ہے:

توسنِ شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب

مطبوعہ صورت میں 'ہے' خوبی کے بعد ہے۔

توسنِ شہ میں وہ خوبی ہے کہ جب

ایک جگہ 'پائیں' کی جگہ مخطوطہ میں 'پاویں' لکھا ہے۔ دوسرے قصیدے میں مطبوعہ لفظ 'لکھیے' کے برخلاف 'لکھتے' کی کتابت کی گئی ہے۔ نسخۂ حمیدیہ اور مخطوطہ زیرِ مطالعہ نسخہ میں اس قصیدے کا عنوان 'در وصف انبہ' لکھا ہے۔ دیوان غالب صدی اڈیشن میں یہ عنوان ندارد ہے۔ پہلے قطع میں مطبوعہ دیوان میں جدید املائی صورت موجود ہے۔ جب کہ حمیدیہ اور مخطوطہ میں قدیم صورت ہی محفوظ ہے۔ پانوں لکھنے کا اس عہد کا رواج تھا۔

غالب پاؤں، گاؤں کو پانو، گانو لکھتے رہے۔ اسی کو جائز اور معتبر سمجھتے رہے۔ پوری غزل جس کا مطلع ہے:

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پانو
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو

پوری غزل کا املا اسی طرح ہے اور 'واؤ' کی ردیف میں پیش کیا گیا ہے۔ کاتب نے بھی املائے غالب کو برقرار رکھا ہے۔ اس سے اس مخطوطے پر نئی روشنی پڑتی ہے۔

مولانا امتیاز علی عرشی نے ذکر کیا ہے کہ بیتاب رام پوری کے مصرع کی اصلاح کی ہے اور 'ں' کو حذف کر دیا ہے۔

'ہے گریباں ہاتھ میں اور پانوءمیں زنجیر ہے'

عام طور پر دہلی اور لکھنؤ میں 'دو ُن' کو غلط سمجھا گیا ہے یعنی واؤ سے قبل بھی اور بعد بھی۔ قاضی عبدالجلیل جنون بریلوی کے خط میں غالب نے صراحت کی ہے۔

مختلف نسخوں کا مطالعہ ایک دلچسپ بات ہے اور حیرت خیز بھی۔ متروک اور متداول کلام کا فرق ملاحظہ ہو۔ ردیف ہائے ہوز کا فرق قابل ذکر ہے۔ متداول نسخوں اور مخطوطہ میں اس ردیف میں کل ۱۲۳ اشعار ہیں۔ جبکہ نسخۂ حمیدیہ میں ستر اشعار موجود ہیں۔ یہ غالب کی انتخابی نظر کا کمال ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے تقریباً پچاس فیصد اشعار کو حذف کر دیا اس عمل نے روحِ سخن کو انتخاب کی صورت بخشی جو مقبولیت اور موثرات میں معاون ہوئی۔ اقبال نے بھی بیش و کم کے ساتھ یہی صورت اپنائی ہے۔ 'بانگ درا' کا تقریباً چالیس فیصد کلام متروکات میں شامل ہے۔

متداول اور مخطوطہ میں ردیف 'ث' میں کوئی غزل نہیں ہے۔ نسخۂ حمیدیہ میں چودہ اشعار پر مشتمل دو غزلیں موجود ہیں۔ مخطوطہ و مطبوعہ کے باب الجیم عربی کے تحت چار اشعار پر مشتمل ایک غزل ہے۔ ایک دوسری غزل کا صرف ایک شعر درج ہے۔

نسخۂ حمیدیہ میں دو غزلیں ہیں جن میں سولہ اشعار ہیں اور تیسری غزل کا ایک شعر سب میں مشترک ہے:

تو ہم مریضِ عشق کے بیمار دار ہیں
اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

یہ اختلاف بھی خوب ہے کہ حمیدیہ میں 'بیمار دار' کی جگہ 'تیماردار' ہے۔ ایسے ہی ردیف 'چ' اور 'ڈ' میں بھی ایک ایک غزل ہے جب کہ حمیدیہ میں 'چ' ردیف میں تین غزلیں اور 'ڈ' میں پانچ غزلیں موجود ہیں۔ 'ح' ردیف میں ایک غزل ہے۔ مخطوطہ اور متداول میں اس ردیف کی کوئی غزل نہیں ہے۔ ردیف 'خ' میں کہیں کوئی غزل نہیں ہے۔ متن میں اختلاف و اضافے کی صورت نے ایک نئی ترتیب و تدوین کی ضرورت کا احساس دلایا ہے۔ خاکسار نے مخطوطہ اور متداول کا سرسری تقابل کیا ہے۔ پورے کلام کے مطالعہ سے اور بھی اختلاف نشاں زد کیے جا سکتے ہیں۔ راقم اس موضوع کا اہل نہیں ہے اسی سبب ایک طالب علمانہ مطالعہ پر اکتفا کیا ہے۔ طول بیانی کا خوف

بھی تفصیل نہیں چاہتا۔

متن میں مذکورہ اختلاف کی نوعیت بہت سنگین یا سنجیدہ نہیں ہے۔ یہ معمولی فرق ہیں۔ جس نسخہ سے نقل کیا گیا ہے اس میں یہ الفاظ درج ہوں گے۔ نقل در نقل میں بھی متن میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ یہ بھی تسلیم کرنے میں قباحت نہیں ہے کہ مختلف نسخوں کی تیاری میں یہ معمولی اختلاف راہ پا جاتے ہیں۔ مولانا امتیاز علی عرشی نے بے نظیر مشقت اور کمال احتیاط سے دیوان مرتب کیا پھر بھی کچھ فروعی باتیں رہ گئیں۔ دنیا کی کوئی شے حرفِ آخر نہیں ہے۔ اطمینان کی بات ہے کہ زیرِ نظر مخطوطہ میں دیوان کا پورا متن موجود ہے۔ غزلوں کی ترتیب میں فرق نہیں ہے اور اشعار کی ترتیب میں بس دو ایک جگہ اوپر نیچے ہو گئے ہیں۔ ہاں طرزِ تحریر میں کافی فرق ہے، جس سے اس عہد کے اندازِ کتابت کا پتہ چلتا ہے۔ غالب کی عام تحریروں کی طرح اس خطی نسخے کو بھی اس زمانے کی املائی صورتوں کے مطالعہ کے لیے اسے ایک اہم دستاویز کہہ سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ مخطوطہ کے ترقیمہ کی عبارت نے اسے استناد بخشی ہے جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ کاتب کا نام منوہر لعل ولد شیولال بن دھیرج لعل ہے یہ ہنڈون میں نقل کیا گیا۔ صاحب رام جی کی فرمائش پر نقل کر کے انھیں پیش کیا گیا۔ ۱۸۶۹ء تاریخ ۲۵ / ماہ مئی عیسوی مطابق ۱۲ / صفر ۱۲۸۶ھ روز شنبہ بوقت شش گھڑی دیوان کی کتابت مکمل ہوئی۔ صاحب رام جی ہنڈن کے رئیس و زمیندار تھے۔ ان کے بارے میں راقم کو زیادہ معلومات نہ مل سکیں۔ ہاں نیشنل آرکائیوز میں ان کے ایک مقدمے کی فائل موجود ہے۔ وہ مجھے مطالعہ کے لیے نہ مل سکی اور کاتب کے بارے میں کچھ علم نہ ہو سکا۔

مطبوعہ کلام میں سولہ رباعیاں ہیں جو مخطوطہ میں بھی موجود ہیں۔ کاغذ بہت خستہ ہے۔ غزلیں تمام و کمال ہیں۔ قصائد و قطعات بھی موجود ہیں۔ یہ عام کتابی سائز پر نقل کیا گیا ہے۔ ہر صفحہ پر ۹ اشعار ہیں کہیں کہیں بارہ اشعار بھی نقل کیے گئے ہیں۔ بیشتر اشعار آمنے سامنے ہیں۔ کتابت پختہ اور قدرے جلی قلم میں ہے۔ ہر ردیف کے بارے میں قدیم روایت کے مطابق باب سین مہملہ باب شین معجمہ، باب کاف عربی، باب کاف فارسی، باب الیا تحتانی وغیرہ کا اہتمام رکھا گیا ہے جو مروجہ دیوان میں نظر نہیں آتا۔ مخطوطہ میں کل ۷۸ ورق ہیں۔ دونوں جانب لکھا گیا ہے۔ صفحات پر نمبر شمار نہیں ہیں۔ بلکہ روایتی انداز کو ترجیح دی گئی ہے۔ یعنی ہر صفحہ کی پشت کے آخری سطر

کے نیچے تعقیبہ (Catch word) کا اہتمام رکھا گیا ہے۔ دیوان کا آغاز بسم اللہ کی آیت سے ہوتا ہے۔ ترقیمہ کے بعد مخطوطہ کے آخری صفحہ پر جے پور کے کسی فقیر کا لطیفہ تحریر کیا گیا ہے جو کاتب کے خط میں نہیں ہے۔ مگر کتابت بہت پختہ اور فارسی زبان میں ہے۔ یہ بعد کی تحریر ہے جسے شاید مخطوطہ کے محافظ نے لکھا ہو۔

ترقیمہ کی عبارت حسب ذیل ہے:

'الحمد للہ والمنت کہ دیوانِ غالب بخط بے ربط بندہ احقر العباد عقیدت اٰمال منوہر لعل ولد شیولال بن دھیرج لال بمقام ہنڈون بموجب حکم جناب عمو یصاحب خداوند نعمت، یکتائے زماں، فیض بخش، قیصر سان، غواص دریائے الفاظ و معنی واقف موقف علوم نکتہ دانی جناب عمو یصاحب صاحبِ ام. جی. بیاس ملاحظہ جناب موصوف دویم بیساکھ سدی پورنماشی سمبت ۱۹۲۰ مطابق ۱۸۶۹ء تاریخ ۲۵ ماہ مئی عیسوی و تاریخ ۱۲ صفر ۱۲۸۶ ہجری روز سہ شنبہ بوقت شش گھڑی روز برآمدہ صورت اختتام پذیرفت۔ امیدوار از صاحبان ملاحظہ ام کہ اگر خطائی رفتہ باشد براہِ عطا عفو فرمایند۔'

قلمی نسخہ کے مطالعہ سے تقویت ملتی ہے کہ دیوانِ غالب کو تدوینِ نو کی ضرورت ہے۔ گو بزرگوں نے تدوین کی اچھی مثالیں قائم کی ہیں اور عمر عزیز کا بڑا حصہ مطالعۂ غالب میں صرف کر کے قابلِ قدر کام انجام دیے ہیں۔ علم بے کراں ہے۔ ہر نئی تحقیق ماضی کی یافت کو مسترد کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔ پھر بھی وہ حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ مستقبل کے امکانات ضرور روشن کرتی ہے۔ غالب پر لکھنے والوں کی ایک کہکشاں ہے۔ امتیاز علی خاں عرشی، حمید اللہ خاں، حامد علی خاں جیسے مقتدر محققین کی بدولت غالب کے کلام کو اعتبار حاصل ہوا۔ پھر بھی ان بزرگوں کے کاموں پر قناعت کر لینا کافی نہیں۔ ان پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ ان غالب شناسوں سے فروعی اور اصولی غلطیاں ہوئی ہیں، جن کا ذکر یہاں مناسب نہیں ہے۔ یہ بات انتہائی تشویش ناک ہے کہ ہمارا ذہن اس آزمائش کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ دوسرے موضوعات کی طرح اب غالب کو بھی بھاری پتھر سمجھ لیا گیا ہے۔ ہم بوسہ دے سکتے ہیں۔ احترام میں طواف بھی کرتے رہتے ہیں مگر کلام

کی جمع وتدوین کی ذمہ داری قبول کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ شاید زمان ومکاں کے حجاب سے کوئی مردِ غیب نمودار ہو اور کلامِ غالب کو مرتب ومدوّن کر سکے۔ دیوانِ غالب کے گم شدہ نسخے کی خبر آئی ہے۔ امید کی شعاعیں طلوعِ صبح کی بشارت دے رہی ہیں؟ غالب سے متعلق افراد اور اداروں کو پہل کرنے کی ضرورت ہے۔ متن کی درستگی کے بغیر افکار و اسالیب کا تعین مشکل ہی نہیں مہمل بھی ہے۔ نسخۂ عرشی و نسخۂ حمیدیہ معاون ہیں، مکمل نہیں:

ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

ان بزرگوں کی کچھ مجبوریاں بھی تھیں۔ یہ اگلے زمانے کے لوگ ہیں یہ پون صدی پہلے کی کوشش ہے جو مواد موجود تھا اس پر تدوین کی بنیاد رکھی گئی۔ تحقیق وتدوین کے جدید تر اصول ان کے پیش نظر نہ تھے۔ ان سے جو بن پڑا، بہتر طور پر انجام دیا۔ کسی فرد سے تکمیلیت کی توقع ایک تمنائے خام ہے۔

□□

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

جراحت تحفہ الماس ارمغاں داغِ جگر ہدیہ
مبارک باد اسد غمخوارِ جانِ دردمند آیا

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

کہتے ہو نہ دینگے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

جراحت تحفہ

دوست دارِ دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

سادگی و پرکاری بیخودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

حالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈا تم نے بارہا پایا

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

دل نہیں تجھکو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

شوق، ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا، سو پریشاں نکلا

دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد
کام یاروں کا بہ قدرِ لب و دنداں نکلا

ہے نو آموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

دل میں پھر گریے نے اک شور اٹھایا غالبؔ
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

بفیضِ بیدلی نومیدیٔ جاوید آساں ہے
کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریٔ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
گر نفَس جادۂ سرمنزلِ تقویٰ نہ ہوا

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے **غالب**
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

بیاں کیا کیجیے بیدادِ کاوش ہائے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

خموشیوں میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آ کر تبسم ہائے پنہاں کا

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالبؔ
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گل ہائے ناز کا

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز
میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا وگرنہ میں
طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اس گرہِ نیم باز کا

تاراج کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسدؔ
سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا
رکھیو یا رب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا

شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا
اس تکلف سے کہ گویا بتکدے کا در کھلا

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا

گو نہ سمجھوں اس کی باتیں گو نہ پاؤں اس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

ہے خیالِ حسن میں حُسنِ عمل کا سا خیال
خُلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

منھ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اُس شوخ کے منھ پر کھلا

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

کیوں اندھیری ہے شبِ غم، ہے بلاؤں کا نزول
آج اُدھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا

کیا رہوں غربت میں خوش، جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

اس کی اُمت میں ہوں میں، میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالب! گنبدِ بے در کھلا

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوّالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا

واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام
گریے سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

یاں سرِ پرشور بے خوابی سے تھا دیوار جو
واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا

یہاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بیخودی
جلوۂ گل وہاں بساطِ صحبتِ احباب تھا

فرش سے تا عرش وہاں طوفاں تھا موجِ رنگ کا
یہاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

ناگہاں اس رنگ سے خوں نابہ ٹپکانے لگا
دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا
تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر گو بیتاب تھا

مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں
پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یہاں
ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالمتاب تھا

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے
کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

یاد کر وہ دن کہ ہر یک حلقہ تیرے دام کا
انتظارِ صید میں اک دیدۂ بیخواب تھا

میں نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے
اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

اک اور قطعہ

اک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تو نے آئنہ تمثال دار تھا

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگذار تھا

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ آبدار تھا

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

وائے دیوانگیِ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہرِ آئنہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط — تو ہو اور آپ بہ صد رنگِ گلستاں ہونا

عشرتِ پارۂ دل، زخمِ تمنا کھانا — لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ — ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا — تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا — جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

مانعِ وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے — خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا

پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حسن — دست مرہونِ حنا رخسار رہنِ غازہ تھا

نالۂ دل نے دیئے اوراقِ لختِ دل بہ باد
یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا — زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائیں گے کیا

بے نیازی

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

حضرتِ ناصح گر آویں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

تجاہل پیشگی سے مدعا کیا
کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا

نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
تغافل ہائے تمکیں آزما کیا

فروغِ شعلہ

فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے
ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا

نفس موجِ محیطِ بیخودی ہے
تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا

دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے
غمِ آوارگی ہائے صبا کیا

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ
شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا

سن اے غارتگرِ جنسِ وفا سن
شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

کیا کس نے جگرداری کا دعویٰ
شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا

یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں
یہ کافر فتنۂ طاقت ربا کیا

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا
روبرو کوئی بتِ آئینہ سیما نہ ہوا

کم نہیں نازشِ ہمنامیٔ چشمِ خوباں
تیرا بیمار برا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا

سینہ کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

نام کا میرے ہے جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہے جو فتنہ کہ برپا نہ ہوا

ہر بنِ مو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خوناب
حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

اسد ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

بہ اندازِ گرم تحفہ ہے شرمِ پارسائی کا
بخونِ غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا

نگاہِ حسن دے ہے یہ جلوہ بینش کہ مہر آسا
چراغِ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا

نہ مارا جان کر بے جرم غافل تیری گردن پر
رہا مانندِ خونِ بے گنہ حق آشنائی کا

تمنائے زباں محوِ سپاسِ بے زبانی ہے
مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بے دست و پائی کا

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

دہانِ ہر بتِ پیغارہ جو زنجیرِ رسوائی
عدم تک بے وفا چرچا ہے تیری بے وفائی کا

زبانی

نہ دی نامہ کو اتنا طول غالبؔ مختصر لکھ دے
کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستمہائے جدائی کا

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائیگا
بے تکلف داغِ مہ مُہرِ دہاں ہو جائیگا

زہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب
پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہو جائیگا

لے تو لوں سوتے میں اسکے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائیگا

دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا
یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائیگا

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائیگا

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط
شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائیگا

باغ میں مجھکو نہ لیجا ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائیگا

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائیگا

فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسدؔ
دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائیگا

دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں | تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

کتنی شیریں ہیں تیری لب کہ رقیب | گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

ہے خبر گرم اونکی آنے کی | آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی | بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی | حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

زخم گر دب گیا لہو نہ تھما | کام گر رک گیا روا نہ ہوا

رہزنی ہے کہ دلستانی ہے | لیکے دل دلستاں روانہ ہوا

کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا | گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخ مکتوب | مگر ستم زدہ ہوں ذوق خامہ فرسا کا

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی | دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا

غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو | مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

ہنوز محرمی

[illegible]
[illegible] تماشا کا

دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

نہ کہہ کہ گریہ بہ مقدارِ حسرتِ دل ہے
مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسدؔ
جفا میں اس کی ہے انداز کارفرما کا

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

جب بہ تقریبِ سفر یار نے محمل باندھا
تپشِ شوق نے ہر ذرہ پہ اک دل باندھا

اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخئ ناز
جوہرِ آئینہ کو طوطئ بسمل باندھا

یاس و امید نے اک عربدہ میداں مانگا
عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا

نہ بندھے تشنگئ ذوق کے مضموں غالبؔ
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں
وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

درماندگی میں غالبؔ کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

تنگیِ دل کا گلہ کیا یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

بعد یک عمرِ ورع بار تو دیتا بارے
کاش رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

اک ذرۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا
یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی
کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خط ایاغ کا

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے
تریاکیِ قدیم ہوں دودِ چراغ کا

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار
یہ مے کدہ خراب ہے مے کے سراغ کا

باغ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل
ابرِ بہار خمکدہ کس کے دماغ کا

وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا
رازِ مکتوب بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا

یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر مت پوچھ
اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

بدگمانی نے نہ چاہا اسے سرگرمِ خرام
رخ پہ ہر قطرہ عرق دیدۂ حیراں سمجھا

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا
نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا

سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی
ہر قدم سائے کو میں اپنے شبستاں سمجھا

تھا گریزاں مژۂ یار سے دل تا دمِ مرگ
دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا

دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اسد
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

سادگی ہائے تمنا یعنی
پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا

عذرِ واماندگی اے حسرتِ دل — نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی — کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی — گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

آہ وہ جرأتِ فریاد کہاں — دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا

پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال — دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا — آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ — اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں — کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد — ہاں کچھ اک رنجِ گراں باریِ زنجیر بھی تھا

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا — بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی — گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا

دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجا ٹھنڈا
نالہ کرتا تہا ولے طالبِ تاثیر بھی تہا

پیشے میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تہا

ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی
آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تہا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تہا

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تہا

لبِ خشک در تشنگی مردگاں کا
زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا

ہمہ ناامیدی ہمہ بدگمانی
میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

تو دوست کسو کا بھی ستمگر نہ ہوا تہا
اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تہا

چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے
خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تہا

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تہا

جب تک کہ نہ دیکھا تہا قدِ یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تہا

میں سادہ دل آزردگیِ یار سے خوش ہوں
یعنی سبقِ شوق مکرر نہ ہوا تہا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تہا

جاری تھی اسدؔ داغِ جگر سے مری تحصیل
آتش کدہ جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا
رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اگتی ہے حنا
کس قدر یا رب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

حاصلِ الفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو
دل بہ دل پیوستہ گویا یک لبِ افسوس تھا

کیا کہوں بیماریٔ غم کی فراغت کا بیاں
جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے
اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے
یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

گو میں

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

ذرہ ذرہ ساغرِ مے خانۂ نیرنگ ہے گردشِ مجنوں بہ چشمک ہائے لیلیٰ آشنا

شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

شکوہ سنجِ رشکِ ہمدیگر نہ رہنا چاہیے میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا

کوہکن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یا رب آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے عرش سے ادھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

درد دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلا دوں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا
ننگ سجدہ سے میرے سنگ آستاں اپنا

تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں ہم نے ہم زباں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

سرمۂ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشم خریدار پہ احساں میرا

رخصت نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم
تیرے چہرے سے ہو ظاہر غم پنہاں میرا

غافل بہ وہم ناز خود آرا ہے ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں طرہ گیاہ کا

بزم قدح سے عیش تمنا نہ رکھ کہ رنگ
صید ز دام جستہ ہے اس دام گاہ کا

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پر گل خیال زخم سے دامن نگاہ کا

جاں در ہوائے یک نگہ گرم ہے اسدؔ
پروانہ ہے وکیل ترے داد خواہ کا

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یا رب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

موج خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستان یار سے اٹھ جائیں کیا

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ باد بہاری کا

حریف جوشش دریا نہیں خودداری ساحل
جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

تجھ سے قسمت میں مری صورت قفل ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

دل ہوا کشمکش چارۂ زحمت میں تمام
مٹ گیا گھسنے میں اس عقدے کا وا ہو جانا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا

ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

دل سے مٹنا تیری انگشتِ حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا
روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

گر نہیں نکہتِ گل کو تیرے کوچے کی ہوس
کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا

تاکہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل
دیکھ برسات میں سبز آئنے کا ہو جانا

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالبؔ
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

باب الباء

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب
دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب

پوچھ مت وجہِ سیہ مستیِ اربابِ چمن
سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

جو ہوا غرقۂ مے بختِ رسا رکھتا ہے
سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب

جس قدر روح نباتی ہے جگر تشنۂ ناز
دے ہے تسکیں بہ دمِ آبِ بقا موجِ شراب

ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر
موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب

چار موج اٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو
موجِ گل موجِ شفق موجِ صبا موجِ شراب

بلو دادہ

بس کہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر
شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب

موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال
ہے تصور میں ز بس جلوہ نما موجِ شراب

نشّے کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ
بس کہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب

ایک عالم پہ ہیں طوفانیِ کیفیتِ فصل
موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسدؔ
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

باب التاء

افسوس کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے
جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر انگشت

کافی ہے نشانی تری چھلے کا نہ دینا
خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت

لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخنِ گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت
پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت

جگر کو مرے عشقِ خونابہ مشرب
لکھے ہے خداوندِ نعمت سلامت

علی الرغمِ دشمن شہیدِ وفا ہوں
مبارک مبارک سلامت سلامت

سخن گل سرو برگ اور اک مئی
تماشائے نیرنگ صورت پرست

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ
یار لائے مری بالیں پہ اسے پر کس وقت

آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست
دودِ شمعِ کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست

اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر
کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

خانہ ویراں سازیِ حیرت تماشا کیجیے
صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست

عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے
کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمارِ دوست

چشمِ ما روشن کہ اس بے درد کا دل شاد ہے
دیدۂ پر خوں ہمارا ساغرِ سرشارِ دوست

غیر یوں کرتا ہے میری پرسش اس کے ہجر میں
بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غم خوارِ دوست

تاکہ میں جانوں کہ ہے اس کی رسائی واں تلک
مجھ کو دیتا ہے پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست

جب کہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ
سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست

چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیِ گفتارِ دوست

مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجیے
یا بیاں کیجے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ

ہے ردیف

ہے ردیف شعر میں غالب ز بس تکرار دوست

باب الجیم عربی

گلشن میں بندوبست برنگ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرون در ہے آج

آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ
تار نفس کمند شکار اثر ہے آج

اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل
سیلاب گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

لو ہم مریض عشق کے تیمار دار ہیں
اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج ہائے ہائے

باب الجیم فارسی

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ

کمال گرمی سعی تلاش دید نہ پوچھ
برنگ خار مرے آئنہ سے جوہر کھینچ

تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار اے دل
کیا ہے کس نے اشارہ کہ ناز بستر کھینچ

تری طرف ہے بحسرت نظارۂ نرگس
بکوری دل و چشم رقیب ساغر کھینچ

بہ نیم غمزہ ادا کر حق ودیعت ناز
نیام پردۂ زخم جگر سے خنجر کھینچ

مرے قدح میں ہے صہبائے آتش پنہاں

ہر روی سفر کہ تاب دل سمند ہے ہیچ

باب الدال مہملہ

حسن غمزے کی کشاکش سوں چھٹا مری بعد
باری آرام سوں ہیں اہل جفا مری بعد

منصب شیفتگی کی کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولی انداز و ادا مری بعد

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا مری بعد

خوں ہے دل خاک میں احوال بتاں پر یعنی
ان کی ناخن ہوئی محتاج حنا مری بعد

درخور عرض نہیں جوہر بیداد کو جا
نگہ ناز ہے سرمہ سی خفا مری بعد

ہے جنوں اہل جنوں کے لیے آغوش وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا مری بعد

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا مری بعد

آئی ہے بیکسی عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائیگا سیلاب بلا مری بعد

بلائیں ہیں جو یہ پیش نظر در و دیوار
نگاہ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار

وفور اشک نے

وفورِ اشک نے کاشانہ کا کیا یہ رنگ
کہ ہوگئی میری دیوار و در در و دیوار

نہیں ہے سایہ کہ سنکر نوید مقدمِ یار
گئی ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار

ہوئی ہے کسقدر ارزانیِ مئے جلوہ
کہ مست ہے تیری کوچہ میں ہر در و دیوار

جو ہے تجھے سرِ سودای انتظار تو آ
کہ ہیں دکانِ متاعِ نظر در و دیوار

ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نی
کہ گر پڑی نہ مری پاؤں پر در و دیوار

وہ آرہا مری ہمسایہ میں تو سایہ سی
ہوئی فدا در و دیوار پر در و دیوار

نظر میں کھٹکی ہی بن تیری گھر کی آبادی
ہمیشہ روتی ہیں ہم دیکھکر در و دیوار

نہ پوچھ بیخودیِ عیشِ مقدمِ سیلاب
کہ ناچتی ہیں پڑی سر بسر در و دیوار

نہ کہہ کسی سی کہ غالب نہیں زمانہ میں
حریفِ رازِ محبت مگر در و دیوار

گھر جب بنا لیا تیری در پر کہی بغیر
جانیگا اب بھی تو نہ مرا گھر کہی بغیر

کہتی ہیں جب رہی نہ مجھی طاقتِ سخن
جانوں کسیکی دل کی میں کیونکر کہی بغیر

کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم
سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

چھوڑوں گا میں نہ اس بتِ کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب ان پر کہے بغیر

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے
سرگرمِ نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا
رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے
مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

ثابت ہوا

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

فنا تعلیمِ درسِ بیخودی ہوں اُس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سے
بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر

نہیں اقلیمِ الفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا
کہ پشتِ چشم سے جس کی نہ ہووے مہر عنواں پر

مجھی اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ یاد آیا — کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا — قیامت اک ہوای تند ہی خاکِ شہیداں پر

نہ لڑ ناصح سی غالب کیا ہوا گر اس نی شدت کی

ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہی گریباں پر

ہی بسکہ ہر اک ان کی اشارے میں نشاں اور — کرتی ہیں محبت تو گزرتا ہی گماں اور

یارب وہ نہ سمجھی ہیں نہ سمجھینگی مری بات — دی اور دل انکو جو نہ دی مجھکو زباں اور

ابرو سی ہی کیا اس نگہِ ناز کو پیوند — ہی تیر مقرر مگر اسکی ہی کماں اور

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھینگی — لی آئینگی بازار سی جاکر دل و جاں اور

ہرچند سبکدست ہوئی بت شکنی میں — ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہی سنگِ گراں اور

ہی خونِ جگر جوش میں دل کھول کی روتا — ہوتی جو کئی دیدۂ خوننابہ فشاں اور

مرتا ہوں اس آواز پہ ہرچند سر اڑ جای — جلاد کو لیکن وہ کہی جائیں کہ ہاں اور

لوگوں کو ہی خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا — ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

لیتا نہ اگر دل تمہیں دیتا کوئی دم چین — کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور

پاتی نہیں جب

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

صفائے حیرت آئینہ ہے سامان زنگ آخر
تغیر آب برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر

نہ کی سامان عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
ہوا جام زمرد بھی مجھے داغ پلنگ آخر

جنوں کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عریانی
گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر

برنگ کاغذ آتش زدہ نیرنگ بیتابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بال یک تپیدن پر

فلک سے ہم کو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاع بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے
شعاع مہر سے تہمت نگہ کی چشم روزن پر

فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغ طالع خاشاک ہے موقوف گلخن پر

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
کہ مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

ستمکش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں
تکلف برطرف مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

مٹ جائے گا سر گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہ شب چار دہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

تم کون سے ایسے تھے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

گذری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ گذارا کوئی دن اور

مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

[illegible]

فارغ مجھے نہ جان کہ مانندِ صبح و مہر ہے داغِ عشق زینتِ جیبِ کفن ہنوز

ہے نازِ مفلساں زرِ از دست رفتہ پر ہوں گل فروشِ شوخیِ داغِ کہن ہنوز

میخانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں خمیازہ کھینچے ہے بتِ بیداد فن ہنوز

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نوردِ وہمِ وجود ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز

وصالِ جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں کہ دیجے آئنۂ انتظار کو پرواز

ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز

نہ پوچھ وسعتِ میخانۂ جنوں غالب
جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

وسعتِ سعیِ کرم دیکھ کہ سر تا سرِ خاک گزرے ہے آبلہ پا ابرِ گہربار ہنوز

یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت نقشِ پا میں ہے تپِ گرمیِ رفتار ہنوز

کیونکر اوس بت سے رکھوں جان عزیز کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

دل ہی نکلا یہ نہ نکلا دل سے
ہے تیری تیر کا پیکان عزیز

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

تو اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

لافِ تمکیں فریبِ سادہ دلی
ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز

ہوں گرفتارِ الفتِ صیاد
ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

وہ بھی دن ہو کہ اس ستمگر سے
ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز

نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خون
جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز

اے ترا غمزہ یک قلم انگیز
اے ترا ظلم سر بسر انداز

تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو
ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز

مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا
میں غریب اور تو غریب نواز

اسد اللہ خاں تمام ہوا
اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

[illegible]

باب عین مہملہ

جادہ رہ خور کو وقت شام ہے تار شعاع
چرخ وا کرتا ہے ماہ نو سے آغوش وداع

رخ نگار سے ہے سوز جاودانی شمع
ہوئی ہے آتش گل آب زندگانی شمع

زبان اہل زباں میں ہے مرگ خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانی شمع

کرے ہے صرف بہ ایمائے شعلہ قصہ تمام
بہ طرز اہل فنا ہے فسانہ خوانی شمع

غم اس کو حسرت پروانہ کا ہے اے شعلہ
ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانی شمع

ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے
بہ جلوہ ریزی باد و بہ پر فشانی شمع

نشاط داغ غم عشق کی بہار نہ پوچھ
شگفتگی ہے شہید گل خزانی شمع

جلے ہے دیکھ کے بالین یار پر مجھ کو
نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغ بدگمانی شمع

باب الفاء

بیم رقیب سے نہیں کرتے وداع ہوش
مجبور یاں تلک ہوئے اے اختیار حیف

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
اے ناتمامی نفس شعلہ بار حیف

بابِ کافِ عربی

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک
کیا مزا ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل
ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک

مجھ کو ارزانی رہے تجھ کو مبارک ہو جیو
نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک

شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج
گردِ ساحل ہے بہ زخمِ موجۂ دریا نمک

داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی واہ واہ
یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وہ جس جا نمک

چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے
دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہیں اعضا نمک

غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توفیرِ درد
زخم مثلِ خندۂ قاتل ہے سر تا پا نمک

یاد ہیں غالبؔ تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل
گرمی بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

باب کاف فارسی

گر تجھ کو ہے یقین اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دل بے مدعا نہ مانگ

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

باب اللام

ہے کس قدر ہلاک فریب وفائے گل
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

آزادی نسیم مبارک کہ ہر طرف
ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دام ہوائے گل

جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا
اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل

خوش حال اُس حریفِ سیہ مست کا کہ جو
رکھتا ہو مثلِ سایۂ گل سر بہ پائے گل

ایجاد کرتی ہے اُسے تیرے لیے بہار
میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل

شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے
مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل

سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی
خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل

تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک
بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل

غالب مجھے ہے اُس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے گلِ جیبِ قبائے گل

باب المیم

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال
ہیں ورق گردانیِ نیرنگِ یک بت خانہ ہم

باوجودِ یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں
ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو
ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ
جانتے ہیں سینۂ پرخوں کو زنداں خانہ ہم

بہ نالہ حاصلِ دلبستگی فراہم کر
متاعِ خانۂ زنجیر جز صدا معلوم

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا، وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا
رکھ لیجو میرے دعوئ وارستگی کی شرم

باب النون

لوں وام بختِ خفتہ سے اک خوابِ خوش ولے
غالبؔ یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں

دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا
شورِ سودائے خط و خال کہاں

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

ایسا آساں نہیں لہو

ایسا آساں نہیں لہو رونا — دل میں طاقت جگر میں حال کہاں

ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق — واں جو جاویں گرہ میں مال کہاں

فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں — میں کہاں اور یہ وبال کہاں

مضمحل ہو گئے قویٰ **غالب**
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں — ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر ان سے — کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو — جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

دل میں آ جائے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے — اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود — قبلے کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے — خار رہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں

اک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائے گا کیا — آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

دیکھیے لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ
اس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں

آبرو کیا خاک اس گل کی کہ گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں

ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب
ذرے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

کیا کہوں تاریکیِ زندانِ غم اندھیر ہے
پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

بس کہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے
جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا
خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری
موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

مرزا ظفر علی

ہوں فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود
قد کی جھکنے کی بھی گنجایش مری تن میں نہیں

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آ سکا
گر اک ادا ہو تو اُسے اپنی قضا کہوں

حلقے ہیں چشم ہائے کشادہ بسوئے دل
ہر تارِ زلف کو نگہِ سرمہ سا کہوں

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں

ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہے ہے خدا نکردہ تجھے بے وفا کہوں

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

زہر ملتا ہی نہیں مجھکو ستمگر ورنہ
کیا قسم ہے تیرے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

غرّۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو — اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں — رنگ لاوے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے — بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں

ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں — اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں

کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا — پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز — نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

بوسہ نہیں نہ دیجیے دشنام ہی سہی — آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

ہر چند جاں گدازیِ قہر و عتاب ہے — ہر چند پشت گرمیِ تاب و تواں نہیں

جاں مطربِ ترانۂ ہل من مزید ہے — لب پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں

خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم — دل میں چھری چبھو مژہ گر خونچکاں نہیں

ہے ننگِ سینہ دل اگر آتشکدہ نہ ہو — ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

نقصاں نہیں جنوں (۲)

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں
گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی
روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

جاں ہے بہائے بوسہ ولے کیوں کہے ابھی
غالبؔ کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہ دیدۂ تصویر نہیں

حسرت لذت آزار رہی جاتی ہے
جادۂ راہ وفا جز دم شمشیر نہیں

رنج نومیدی جاوید گوارا رہیو
خوش ہوں گر نالہ زبونی کش تاثیر نہیں

سر کھجاتا ہے جہاں زخم سر اچھا ہو جائے
لذت سنگ باندازۂ تقریر نہیں

جب کرم رخصت بیباکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر بجز خجلت تقصیر نہیں

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں

مت مردمک دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں
ہیں جمع سویدائے دل چشم میں آہیں

برنگِ گل گرہ عاشق ہی دیکھا چاہیئی
کھل گئی ہی مانندِ گل سو جا سی دیوارِ چمن

الفتِ گل سی غلط ہی دعوی وارستگی
سرو ہی با وصفِ آزادی گرفتارِ چمن

عشق تاثیر سی نومید نہیں
جانسپاری شجرِ بید نہیں

سلطنت دست بدست آتی ہی
جام یہ خاتمِ جمشید نہیں

ہی تجلی تری سامانِ وجود
ذرہ بی پرتوِ خورشید نہیں

رازِ معشوق نہ رسوا ہو جای
ورنہ مر جانی میں کچھ بھید نہیں

گردشِ رنگِ طرب سی ڈر ہی
غمِ محرومیِ جاوید نہیں

کہتی ہیں جیتی ہیں امید پہ لوگ
ہمکو جینی کی بھی امید نہیں

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتی ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتی ہیں

دل آشفتگاں خالِ کنجِ دہن کی
سویدا میں سیرِ عدم دیکھتی ہیں

تری سرو قامت سی اک قدِ آدم
قیامت کی فتنی کو کم دیکھتی ہیں

تماشا کہ ای محوِ آئینہ داری
تجھی کس تمنا سی ہم دیکھتی ہیں

سراغِ تفِ نالہ لی داغِ دل سی
کہ شب رو کا نقشِ قدم دیکھتی ہیں

[illegible]

بناکر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

جو منکرِ وفا ہو فریب اس پہ کیا چلے
کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

میں اور حظِ وصل خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

کل کے لیے کر آج نہ خسّت شراب میں
یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

غالب ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوتراب میں

عمران بیگ

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہگزر کو میں

ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیداد گر کو میں

پھر بے خودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا
سمجھا ہوں دل پذیر متاعِ ہنر کو میں

غالبؔ خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

وعدۂ سیرِ گلستاں ہے خوشا طالعِ شوق
مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں

شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفیِ منصور نہیں

حسرت اے ذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی
عشقِ پر عربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو
تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

صاف دُردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ
وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں

وائے محرومیِ تسلیم و بدا حالِ وفا
جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں

رنگِ تمکینِ گل و لالہ پریشاں کیوں ہے
گر چراغانِ سرِ رہ گزرِ باد نہیں

سبدِ گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں
مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں

نقش سی کرنی ہیں انسانیت پر اور نہ گویا — دنی ہی بجا ہیں ورنہ اسکو وہم ایجاد نہیں
کم نہیں جلوہ گری میں تیری گرچہ بستی غرب — ہی نقشہ ہی ولی اسقدر آباد نہیں

کرتی ہو کیوں مجھ سے ہی غربت کی شکایت غالب
تمکو بے مہری یاران وطن یاد نہیں

دور جہاں وہی کی رو سے سمجھی ہیں خوش رہا — بہاں اگر ہی حقہ شعر حرم کہ تکرار کیا کرین
تہذیب ملک کی ہر مقام پہ دو چار رہ گئی — تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کرین

کیا شمع کی نہیں ہیں ہواخواہ اہل بزم
ہو غم ہی جانگداز تو غمخوار کیا کرین

ہنگامہ ہی خبر کی نہیں بیانی کا گزر — عشق کجا رسکر گمان ہم نے بالوں پر نہیں

تمامت ہی حسن سے بھی کما دشت غیر ممکن ہوا — تعجب سے ہو رہا ہوں ہی ہو باقی زمانہ میں

دل نازک پہ اسکی رحم آتا ہی مجھی غالب
نکر سرگرم اوس کافر کو الفت آزمانی میں

دل لگا کر لگ گیا ان کو بھی تنہا بیٹھنا — بارے اپنی بیکسی کی ہم نے پائی داد یان

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ بادیاں

مطلعِ دیگر

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

نظر لگے نہ کہیں اوسکے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

ترے جواہرِ طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

نہیں کہ مجھکو قیامت کا اعتقاد نہیں
شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا برائی ہے
بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں

جو آؤں سامنے اون کے تو مرحبا نہ کہیں
جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں
کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہمکو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

نادر نگار

تم ان کے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالبؔ
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں
ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے
ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

تیری فرصت کے مقابل اے عمر
برق کو پابہ حنا باندھتے ہیں

قید ہستی سے رہائی معلوم
اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں

نشۂ رنگ سے ہے واشدِ گل
مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

اہلِ تدبیر کی واماندگیاں
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

سادہ پرکار ہیں خوباں غالبؔ
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسدؔ
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انساں ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یا رب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے
لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ
رتبہ میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

کرتے ہو مجھ کو منعِ قدم بوس کس لیے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

غالبؔ وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

بہزاد لکھی

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیٔ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

بس کہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

دیوانگی سے دوش پہ زنّار بھی نہیں
یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

گنجائشِ عداوتِ اغیار یک طرف
یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

ڈر نالہ ہائے زار سے میرے خدا کو مان
آخر نوائے مرغِ گرفتار ہم بھی ہیں

دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روکشی
حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

نہیں ہے زخم کوئی بخیے کے درخور مرے تن میں
ہوا ہے تارِ اشکِ یاس رشتہ چشمِ سوزن میں

ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی
کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

ودیعت خانۂ بیدادِ کاوش ہائے مژگاں ہوں
نگینِ نامِ شاہد ہے مرا ہر قطرۂ خوں تن میں

بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

نکوہش مانعِ بے ربطیِ شورِ جنوں آئی
ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

ہوئے اس مہر وش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پر افشاں جوہر آئینے میں مثلِ ذرہ روزن میں

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

ہزاروں دل دیے جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو
سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرۂ خوں تن میں

اسد زندانیِ تاثیرِ الفت ہائے خوباں ہوں
خمِ دستِ نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں

مری جہان کی اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خونِ جگر سو جگر میں خاک نہیں

مگر غبار ہوئے پر ہوا اڑا لیجائے
وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے
کہ غیر جلوۂ گل رہگزر میں خاک نہیں

بھلا اسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا
اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں

خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش
شرابخانہ کی دیوار و در میں خاک نہیں

ہوا ہوں عشق کی غارتگری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

ہمارے شعر ہیں اب صرف دلگی کے اسد
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

کوئی

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیمروز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

دشنۂ غمزہ جانستاں ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حسن اور اس پہ حسنِ ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

واں وہ غرورِ عز و ناز یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

پرسشِ طرزِ دلبری کیجیے کیا کہ بن کہے
اس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

رات کے وقت مے پیے ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھیے
سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

بزم میں اس کے روبرو کیوں نہ خموش بیٹھیے
اس کی تو خامشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ یوں

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

مجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کس طرح
دیکھ کے میری بیخودی چلنے لگی ہوا کہ یوں

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آئینہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پا کہ یوں

گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال
موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

ردیف ی

باب الواو

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

بقدرِ حسرتِ دل چاہیے ذوقِ معاصی بھی
بھروں یک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو

اگر وہ سرو قد گرمِ خرامِ ناز آ جاوے
کفِ ہر خاکِ گلشن شکلِ قمری نالہ فرسا ہو

کعبے میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے
ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سرنوشت کو

غالب کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے
خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بار نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ
ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا
یوں ہو تو چارۂ غم الفت ہی کیوں نہ ہو

ڈالا نہ بیکسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

ہنگامۂ زبونی ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں
اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

مٹتا ہے فوت فرصت ہستی کا غم کوئی
عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو

اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسد
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا برا کیا ہے نوا سنجان گلشن کو

نہیں گر ہمدمی آساں نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے
نہ دی ہوتی خدا یا آرزوئے دوست دشمن کو

نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اس جراحت پر
کیا سینے میں جس نے خونچکاں مژگان سوزن کو

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو

ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا
کیا بیتاب کاں میں جنبش جوہر نے آہن کو

ردیف یا

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ خو مجھ کو
جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو

مرے شاہِ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالب
فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کی پانو
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کی پانو

دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کی پانو
ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کی پانو

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کی پانو

مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور
تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کی پانو

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعدِ مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کی پانو

ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
اڑتے ہوئے الجھتے ہیں مرغِ چمن کی پانو

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دکھتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کی پانو

غالبؔ مرے کلام میں کیونکر مزا نہو
پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانو

وہاں اُس کو ہولِ دل ہے تو یہاں میں ہوں شرمسار
یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہو

اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم تو دیکھیے
آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہو

واں پہونچکر جو غش آتا پئے ہم ہے ہمکو
صد رہ آہنگِ زمیں بوس قدم ہے ہمکو

دل کو میں اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہے
کس قدر ذوقِ گرفتاریِ ہم ہے ہمکو

ضعف سے نقشِ پئے مور ہے طوقِ گردن
تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہمکو

جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو
یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہمکو

رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں
نالۂ مرغِ سحر تیغِ دو دم ہے ہمکو

سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا
ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہمکو

دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ ولیکن ناچار
پاسِ بے رونقیِ دیدہ اہم ہے ہمکو

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہمکو

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہمکو

بقلم سلیم نوری

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

بچتے نہیں مؤاخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

کیا وہ بھی بے گنہ کش و حق ناشناس ہیں
مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو

ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

جب مے کدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ ترا جلوہ گاہ ہو

غالب بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں
دنیا ہو یا رب اور مرا بادشاہ ہو

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیوں کر ہو
کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیوں کر ہو

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیوں کر ہو

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے
حیا ہے اور یہی گو مگو تو کیوں کر ہو

ہمیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا — بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو

الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ — جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا — وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

ہمیں پھر ان سے امید اور انہیں ہماری قدر — ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیونکر ہو

غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا — نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیونکر ہو

بتاؤ اس مژہ کو دیکھ کر کہ مجھ کو قرار — یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیونکر ہو

مجھے جنوں نہیں غالب ولے بقولِ حضور
فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو — نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں — سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو — نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا — تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم — گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ — کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

غلطی عفو دلا

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالبؔ
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

باب الہاء ہوز

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غمکدہ
جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

ناچار بیکسی کی بھی حسرت اٹھائیے
دشواریِ رہ و ستمِ ہمرہاں نہ پوچھ

باب الیائے تحتانی

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے ۔ طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے

ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق ۔ یعنی ہنوز منتِ طفلاں اٹھائیے

دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم ۔ اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے

یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجیے
یا پردۂ تبسمِ پنہاں اٹھائیے

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے ۔ بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر ۔ آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری ۔ تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی ۔ ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیے

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو ۔ اک گونہ بےخودی مجھے دن رات چاہیے

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا ۔ ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

سر پائے خم پہ چاہیے ہنگامِ بےخودی ۔ رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے

یعنی بحسبِ گردش

یعنی بحسبِ گردشِ پیمانۂ صفات ؛ عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیے

نشو و نما ہے اصل سے غالب فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے
مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

نہ اتنا بُرّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی

مئے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

مرے دل میں ہے غالب شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

ہے دورِ قدح وجہِ پریشانیِ صہبا
یکبار لگا دو خمِ مے میرے لبوں سے

رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاہد
زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے

بیداد وفا دیکھ کہ جاتی رہی آخر ہر چند مری جان کو تھا ربط بدن سی

قطعہ

تا ہمکو شکایت کی بہی باقی نہ رہی جا سن لیتی ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتی

غالب ترا احوال سنا دینگی ہم انکو
وہ سنکی بلا لیں یہ اجارا نہیں کرتی

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اوسی غارت کرتا
وہ جو رکھتی تھی ہم اک حسرت تعمیر سو ہی

غم دنیا سی گر پائی بھی فرصت سر اوٹھانیکی فلک کا دیکھنا تقریب تیری یاد آنیکی

کھلیگا کس طرح مضموں مری مکتوب کا یارب قسم کھائی ہی اوس کافر نی کاغذ کی جلانیکی

لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہی ولی مشکل ہی حکمت دل میں سوز غم چھپانیکی

اونہیں منظور اپنی زخمیوں کا دیکھ آنا تھا اوٹھی تھی سیر گل کو دیکھنا شوخی بہانیکی

ہماری سادگی تھی التفات ناز پر مرنا ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانیکی

لکد کوب حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کی ناز اوٹھانیکی

کہوں کیا خوبی اوضاع ابنای زماں غالب بدی کی اوسنی جس سی ہمنی کی تھی بارہا نیکی

حاصل لکی

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی
دل جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی

اُس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے

حالانکہ ہے یہ سیلیِ خارا سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے

کی اس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا
آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں
فرماں روائے کشورِ ہندوستان ہے

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

ہے بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر
غالب ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہرباں ہے

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے

کیوں مری غمخوارگی کا تجھکو آیا تھا خیال — دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا — عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی — یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے

گلفشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا — خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں — ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی — اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

کس طرح کاٹے کوئی شبہائے تارِ برشکال — ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے

گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ وصال — ایکدل تسپر یہ ناامیدواری ہائے ہائے

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا — دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے

عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے — تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر — اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے

کیجے بیاں سرورِ تبِ غم کہاں تلک — ہر مو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے

[illegible]

ہے وہ غرورِ حسن سے بیگانۂ وفا
ہر چند اس کے پاس دلِ حق شناس ہے

پی جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

ہر اک مکاں کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ
دل فردِ جمع و خرچِ زباں ہائے لال ہے

کس پردے میں ہے آئنہ پرداز اے خدا!
رحمت کہ عذر خواہ لبِ بے سوال ہے

ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی
اے شوقِ منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

مشکیں لباسِ کعبہ علی کے قدم سے جان
نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے

وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا
دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو
حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

دا ہی ہمہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے نہ آہِ نیم شبی ہے

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا سو بھی مٹ گیا
ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں
ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے

ہے وہی بدمستیٔ ہر ذرہ کا خود عذر خواہ
جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی
زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

آنکھ کی تصویر سر نامے پہ کھینچی ہے کہ تا
تجھ پہ کھل جاوے کہ اس کو حسرتِ دیدار ہے

پنیس میں گزرتی ہیں جو گزرتی ہیں وہ میری
کہنے ہی کہاروں کو سینے نہیں دیتی

مری ہستی فضائے حیرت آبادِ تمنا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

خزاں کیا فصلِ گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

رنائی دیران

وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم
اثر فریادِ دل ہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

نہ لائی شوخیِ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

رحم کر ظالم کہ کیا بودِ چراغِ کشتہ ہے
نبضِ بیمارِ وفا دودِ چراغِ کشتہ ہے

دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں
ورنہ یاں بے رونقی سودِ چراغِ کشتہ ہے

چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے

پیکرِ عشاق سازِ طالعِ ناساز ہے
نالہ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے

دستگاہِ دیدۂ خوں بارِ مجنوں دیکھنا
یک بیاباں جلوۂ گل فرشِ پا انداز ہے

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے | غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو | آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام | دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں | نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلک نا انصاف | آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے | بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے | صبح وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے

ڈھونڈے ہے اس مغنی آتش نفس کو جی | جس کی صدا ہو جلوۂ برق فنا مجھے

مستانہ طے کروں ہوں رہ وادی خیال | تا باز گشت سے نہ رہے مدعا مجھے

کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں | آنے لگی ہے نکہت گل سے حیا مجھے

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ | شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے — بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے
دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا — میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے
رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہنِ مے — مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے
بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر — حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے
مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم — تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے
کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو — کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے
صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو — دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے
ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں — بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے

غالب تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے

رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے — اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

مینائے مے ہے سروِ نشاطِ بہار سے
بالِ تدرو جلوۂ موجِ شراب ہے

زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا
نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے

جادادِ بادہ نوشئ رنداں ہے شش جہت
غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

نظارہ کیا حریف ہو اس برقِ حسن کا
جوشِ بہار جلوہ کو جس کی نقاب ہے

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں
مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے

گزرا اسد مسرتِ پیغامِ یار سے
قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے
آبگینہ تندئ صہبا سے پگھلا جائے ہے

غیر کو یا رب وہ کیونکر منعِ گستاخی کرے
گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

دورِ چشمِ بد تری بزمِ طرب سے واہ واہ
نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

اس کی بزم آرائیاں سن کر دلِ رنجور یاں
مثلِ نقشِ مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے

نقش کو اس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں
کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسدؔ
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے
تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے

نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے

کثرت آرائیِ وحدت ہے پرستاریِ وہم
کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے

ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برقِ خرمنِ راحت خونِ گرمِ دہقاں ہے

غنچہ تا شگفتنہا برگِ عافیت معلوم
باوجودِ دلجمعی خوابِ گل پریشاں ہے

ہم سے رنجِ بیتابی کس طرح اٹھایا جائے

داغ نے بیت رحجبر نسخۂ حسن بیان ہے

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

سادگی پر اس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

بس ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

رنجِ رہ کیوں کھینچیے واماندگی کو عشق ہے
اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی
فتنۂ شورِ قیامت کس کے آب و گل میں ہے

ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

دل سے تیری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذتِ فراغ
تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

اُڑتی پھرے ہے خاک مری

اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں | بارے اب اے ہوا ہوس بال و پر گئی
دیکھو تو دلفریبی انداز نقش پا | موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی
ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی | اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی
نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا | مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی
فردا و دی کا تفرقہ یکبار مٹ گیا | کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے | حوران خلد میں تری صورت مگر ملے
اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعد قتل | میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے
ساقی گری کی شرم کرو ورنہ آج ہم | ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے
تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم | میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے
تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا | فرصت کشاکش غم پنہاں سے گر ملے
لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں | جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

اے ساکنان کوچۂ دلدار دیکھنا

تمکو ہمیں جو غالب آشفتہ سر ملی

کوئی دن گر زندگانی اور ہے — اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں — سوزِ غمہائے نہانی اور ہے

بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں — پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

دیکے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر — کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم — وہ بلائے آسمانی اور ہے

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام

ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

کوئی امید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں — میری آواز گر نہیں آتی

داغِ دل ا

داغِ دل گر نظر نہیں آتا
بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

منہ میں میں بھی زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

جبکہ تجھ بن کوئی نہیں موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

ہمکو اُن سی وفا کی ہی اُمید — جو نہیں جانتی وفا کیا ہی

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا — اور درویش کی صدا کیا ہی

جان تم پر نثار کرتا ہوں — میں نہیں جانتا دعا کیا ہی

میں نی مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مفت ہاتھ آئی تو برا کیا ہی

کہتی تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مو آئی — یک مرتبہ گھبرا کی کہو کوئی کہ وہ آئی

ہوں کشمکشِ نزع میں ہاں جذبِ محبت — کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مری پوچھنی کو آئی

ہی صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم — آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئی

ظاہر ہی کہ گھبرا کی نہ بھاگینگی نکیرین — ہاں منہ سی مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئی

جلاد سی ڈرتی ہیں نہ واعظ سی جھگڑتی — ہم سمجھی ہوئی ہیں اُسی جس بھیس میں جو آئی

ہاں اہلِ طلب کون سنی طعنۂ نایافت — دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنی ہی کو کھو آئی

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سی بیٹھیں — اُس در پہ نہیں بار تو کعبی ہی کو ہو آئی

کی ہمنفسوں نی اثرِ گریہ میں تقریر — اچھی رہی آپ اُس سی مگر مجھکو ڈبو آئی

اس انجمنِ ناز کی کیا بات ہی غالبؔ

ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے — سینہ جویائے زخمِ کاری ہے

پھر جگر کھودنے لگا ناخن — آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز — پھر وہی پردۂ عماری ہے

چشم دلّالِ جنسِ رسوائی — دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے

وہی صد رنگ نالہ فرسائی — وہی صد گونہ اشکباری ہے

دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر — محشرستانِ بیقراری ہے

جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے — روزِ بازارِ جاں سپاری ہے

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

قطعہ

پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز — گرم بازارِ فوجداری ہے

ہو رہا ہے جہان میں اندھیر — زلف کی پھر سرشتہ داری ہے

پھر دیا پارۂ جگر نے سوال
ایک فریاد و آہ و زاری ہے

پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب
اشک باری کا حکم جاری ہے

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا
آج پھر اس کی روبکاری ہے

بیخودی بے سبب نہیں غالبؔ
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی
نمک پاشِ خراشِ دل ہے لذت زندگانی کی

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی
ہوئی زنجیرِ موجِ آب کو فرصت روانی کی

پس از مردن بھی دیوانہ زیارت گاہِ طفلاں ہے
شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گل فشانی کی

نکوہش ہے سزا فریادیِ بیدادِ دلبر کی
مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبحِ محشر کی

رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے
اگر بو دے بجائے دانہ دہقاں نوک نشتر کی

پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیِ مے تھا
ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی

کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی عرض کیا قدرت
کہ طاقت اڑ گئی اڑنے سے پہلے میرے شہپر کی

[illegible]

کہاں تک روؤں اوس کی خیمہ کی پیچھی قیامت ہی
مری قسمت مین یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

بی اعتدالیون سی سبک سب مین ہم ہوئی
جتنی زیادہ ہو گئی اوتنی ہی کم ہوئی

پنہان تہا دام سخت قریب آشیان کی
اوڑنی نہ پائی تہی کہ گرفتار ہم ہوئی

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہی
یان تک مٹی کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئی

سختی کشانِ عشق کی پوچہی ہی کیا خبر
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئی

تیری وفا سی کیا ہو تلافی کہ دہر مین
تیری سوا بہی ہم پہ بہت سی ستم ہوئی

لکہتی رہی جنون کی حکایات خونچکان
ہر چند اوس مین ہاتہ ہماری قلم ہوئی

اللہ ری تیری تندیِ خو جسکی بیم سی
اجزای نالہ دل مین مری رزق ہم ہوئی

اہلِ ہوس کی فتح ہی ترکِ نبردِ عشق
جو پانون اوٹہ گئی وہی اونکی علم ہوئی

نالی عدم مین چند ہماری سپرد تہی
جو وان نہ کہنچ سکی سو وہ یان آکی دم ہوئی

چہوڑی اسد نہ ہم نی گدائی مین دل لگی
سائل ہوئی تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئی

جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی
تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی

مجھے اس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی
کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی مری کہانی

یوں ہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا
کہ مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

نے مژدۂ وصال نہ نظّارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

مے نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے حجاب
اے شوق یاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا
کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

دیدار بادہ حوصلہ ساقی نگاہ مست
بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بنغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطف اللہ [illegible]

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ — یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں — نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی — اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے — طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے — نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

گریہ نکالے ہے تیری بزم سے مجھ کو — ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے

ہم سے عبث ہے گمانِ رنجشِ خاطر — خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے

دل سے اٹھا لطفِ جلوہ ہائے معانی — غیرِ گل آئینۂ بہار نہیں ہے

قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے — وائے اگر عہد استوار نہیں ہے

تو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے غالبؔ
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

ہجوم غم سے یہاں تک سرنگونی مجھکو حاصل ہے — کہ تار دامن و تار نظر میں فرق مشکل ہے

رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی — سمجھیو مت کہ پاس درد سے دیوانہ غافل ہے

وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالبؔ
چٹکنا غنچۂ گل کا صدائے خندۂ دل ہے

با دامن ہے بہار ہا ہوں بسکہ میں صحرا نورد — خار پا ہیں جوہر آئینۂ زانو مجھے

دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت — ہے نگاہ آشنا تیرا سر ہر مو مجھے

ہوں سراپا ساز آہنگ شکایت کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے — جاں کالبد صورت دیوار میں آوے

سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر — تو اس قد دلکش سے جو گلزار میں آوے

تب ناز گراں مایگی اشک بجا ہے — جب لخت جگر دیدۂ خوں بار میں آوے

دے مجھکو شکایت کی اجازت کہ ستمگر — کچھ تجھکو مزا بھی مرے آزار میں آوے

اس چشم فسوں گر کا اگر پائے اشارا — طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے

[illegible]

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سی یارب
اک آبلہ پا وادیِ پرخار میں آوی

مر جاؤں نہ کیوں رشک سی جب وہ تنِ نازک
آغوشِ خمِ حلقۂ زنار میں آوی

غارتگرِ ناموس نہو گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گل باغ سی بازار میں آوی

تب چاکِ گریباں کا مزا ہی دلِ نالاں
جب اک نفس الجھا ہوا ہر تار میں آوی

آتشکدہ ہی سینہ مرا رازِ نہاں سی
ای وای اگر معرضِ اظہار میں آوی

گنجینۂ معنی کا طلسم اوسکو سمجھیی
جو لفظ کہ غالب مری اشعار میں آوی

حسنِ مہ گرچہ بہنگامِ کمال اچھا ہے
اوس سی میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہی

بوسہ دیتی نہیں اور دل پہ ہی ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتی ہیں کہ مفت آئی تو مال اچھا ہی

اور بازار سی لی آئی اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سی مرا جامِ سفال اچھا ہی

بی طلب دیں تو مزا اوس میں سوا ملتا ہی
وہ گدا جسکو نہو خوی سوال اچھا ہی

اون کی دیکھی سی جو آجاتی ہی منہ پر رونق
وہ سمجھتی ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہی

دیکھیی پاتی ہیں عشاق بتوں سی کیا فیض
اک برہمن نی کہا ہی کہ یہ سال اچھا ہی

ہم سخن تیشی نی فرہاد کو شیریں سی کیا
جسطرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہی

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

خضر سلطاں کو رکھے خالق اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

خار خار الم حسرت دیدار تو ہے
شوق گلچین گلستان تسلی نہ سہی

مے پرستاں خم مے منہ سے لگائے ہی بنے
ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

نفس قیس کہ ہے چشم و چراغ صحرا
گر نہیں شمع سیہ خانۂ لیلی نہ سہی

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

عشرت صحبت خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالب اگر عمر طبیعی نہ سہی

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سائے سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

قضا نے تھا مجھے چاہا خراب بادۂ الفت
فقط خراب لکھا بس نہ چل سکا قلم آگے

غم زمانہ نے جھاڑی

غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی
وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے

خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا
کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے
تمہارے آئیو اے طرہ ہائے خم بہ خم آگے

دل و جگر میں پر افشاں جو ایک موجۂ خوں ہے
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے

قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالبؔ
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیے تو گلا ہوتا ہے

پر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

گو سمجھتا نہیں پر حسنِ تلافی دیکھو
شکوۂ جور سے سر گرمِ جفا ہوتا ہے

عشق کی راہ میں ہے چرخِ مکوکب کی وہ چال
سست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم
آپ اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

خامہ میرا کہ وہ ہے باربدِ بزمِ سخن
شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

اے شہنشاہِ کواکب سپہ و مہرِ علم
تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے

سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے
تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے

ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال
آستاں پر ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے

میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزل خوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہے

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوفِ بد آموزیٔ عدو کیا ہے

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام مشک بو کیا ہے

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

رہی نہ طاقت گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

میں انہیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں
چل نکلتے جو مے پیے ہوتے

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاشکے تم مرے لیے ہوتے

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یا رب کئی دیے ہوتے

آ ہی جاتا وہ راہ پر غالب
کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ
ہتھکنڈے ہیں چرخ نیلی فام کے

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم
دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا مگر
یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے

شاہ کے ہے غسلِ صحت کی خبر
دیکھیے کب دن پھریں حمام کے

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر
روکشِ سطحِ چرخِ مینائی

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی

سبزہ و گل کے دیکھنے کے لیے
چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے باد پیمائی

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب
شاہِ دیندار نے شفا پائی

شاہ وہ مندار نی نغا باے

تغافل دوست ہوں میرا دماغ عجز عالی ہے
اگر پہلو تہی کیجے تو جا میری بھی خالی ہے

رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو مے خانہ خالی ہے

کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

خلش غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ
دیکھ خوں نابہ فشانی میری

کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار
مگر آشفتہ بیانی میری

ہوں زخود رفتۂ بیدائے خیال
بھول جانا ہے نشانی میری

متقابل ہے مقابل میرا
رک گیا دیکھ روانی میری

قدر سنگ سر رہ رکھتا ہوں
سخت ارزاں ہے گرانی میری

گرد باد رہ بیتابی ہوں
صرصر شوق ہے بانی میری

دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا
کھل گئی ہیچمدانی میری

کر دیا ضعف نے عاجز غالب
ننگ پیری ہے جوانی میری

نقش ناز بت طناز بہ آغوش رقیب
پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

تو وہ بد خو کہ تحیر کو تماشا جانے
غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

وہ تب عشق تمنا ہے کہ پھر صورت شمع
شعلہ تا نبض جگر ریشہ دوانی مانگے

گلشن کو تری صحبت از بسکہ خوش آئی ہے
ہر غنچے کا گل ہونا آغوش کشائی ہے

واں کنگر استغنا ہر دم ہے بلندی پر
یاں نالے کو اور الٹا دعوائے رسائی ہے

از بسکہ سکھاتا ہے غم ضبط کے اندازے
جو داغ نظر آیا اک چشم نمائی ہے

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یا رب اسے قسمت میں عدو کی

اچھا ہے سر انگشت حنائی کا تصور
دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے
یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

دشنے نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو
خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

صد حیف

صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب
حسرت میں رہی ایک بت عربدہ جو کی

سیماب پشت گرمی آئینہ دے ہے ہم　　حیراں کئے ہوئے ہیں دل بیقرار کی

آغوش گل کشودہ برای وداع ہے
ای عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

ہے وصل ہجر عالم تمکین ضبط میں　　معشوق شوخ و عاشق دیوانہ چاہیے

اس لب سے مل ہی جائیگا بوسہ کبھی تو ہاں
شوق فضول و ہمت رندانہ چاہیے　　جرأت

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے　　یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے
صحبت رنداں سے واجب ہے حذر　　جای مے اپنے کو کھینچا چاہیے
چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل　　بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے
چاک مت کر جیب بے ایام گل　　کچھ ادھر کا بھی اشارا چاہیے
دوستی کا پردہ ہے بیگانگی　　منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

دشمنی نے میری کھویا غیر کو
کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیے

اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی
یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے

غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

درسِ عنوانِ تماشا بہ تغافل خوشتر
ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے

وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں
صورتِ دود رہا سایہ گریزاں مجھ سے

غمِ عشاق نہ ہو سادگی آموزِ بتاں
کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں
صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

بیخودی بسترِ تمہیدِ فراغت ہو جو
پُر ہے سائے کی طرح میرا شبستاں مجھ سے

شوقِ دیدار میں گر تو مجھے بیرون ماری
ہو نگہ مثلِ گلِ شمع پریشاں مجھ سے

بیکسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت ہے ہے
سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

گردن

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے
آئینہ داریِ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا
ہاتھ آویں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

چاک کی خواہش اگر وحشت بہ عریانی کرے
صبح کے مانند زخمِ دل گریبانی کرے

جلوہ کا تیری وہ عالم ہے کہ گر کیجے خیال
دیدۂ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے

ہے شکستن سے بھی دل نومید یارب کب تلک
آبگینہ کوہ پر عرضِ گراں جانی کرے

میکدہ گر چشمِ مستِ ناز سے پاوے شکست
موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

خطِ عارض سے لکھا ہے زلف کو الفت نے عہد
یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے

وہ آ کے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے
ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

دکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے
مرا سر رنجِ بالیں ہے مرا تن بارِ بستر ہے

سرشکِ سر بصحرا دادہ نورالعینِ دامن ہے
دلِ بے دست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہے

خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو تم آئے ہو
فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے

بقیہ [illegible]

بطوفاں گاہ جوش اضطراب شام تنہائی
شعاع آفتاب صبح محشر تار بستر ہے

ابھی آتی ہے بو بالش سے اس کی زلف مشکیں کی
ہماری دید کو خواب زلیخا عار بستر ہے

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجر یار میں غالب
کہ بیتابی سے ہر اک تار بستر خار بستر ہے

خطر ہے رشتۂ الفت رگ گردن نہ ہو جاوے
غرور دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہو جاوے

سمجھ اس فصل میں کوتاہی نشو و نما غالب
اگر گل سرو کی قامت پہ پیراہن نہ ہو جاوے

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابند نے نہیں ہے

کیوں بوتے ہیں باغباں تونبے
گر باغ گدائے مے نہیں ہے

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے
پر تجھ سی کوئی شے نہیں ہے

ہاں کھائیو مت فریب ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

شادی سے گذر کہ غم نہ ہووے
اردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے

کیوں رد قدح کرے ہے زاہد
مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالبؔ
آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا
کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں ولے ان کی تمنا نہیں کرتے

در پردہ انہیں غیر سے ہے ربطِ نہانی
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے

یہ باعثِ نومیدیٔ اربابِ ہوس ہے
غالبؔ کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ
خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے

کبھی تو اس دلِ شوریدہ کی بھی داد ملے
کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہے

بجا ہے گر نہ سنے نالہ ہائے بلبلِ زار
کہ گوشِ گل نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے

اسدؔ ہے نزع میں چل بے وفا برائے خدا
مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے

کمال انور

کیوں نہ ہو چشمِ بتاں محوِ تغافل کیوں نہ ہو
یعنی اس بیمار کو نظارے سے پرہیز ہے

مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی
وائے ناکامی کہ اس کافر کا خنجر تیز ہے

عارضِ گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسدؔ
جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہیے
ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہیے

یہ ضد کہ آج نہ آوے اور آئے بن نہ رہے
قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے

رہے ہے یوں گہ و بے گہ کہ کوئے دوست کو اب
اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہیے

زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ بن کہے ہی انہیں سب خبر ہے کیا کہیے

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال
کہ یہ کہے کہ سرِ رہگزر ہے کیا کہیے

تمہیں نہیں ہے سرِ رشتۂ وفا کا خیال
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا کہیے

انہیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے کیوں لڑیے
ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے کیا کہیے

حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجے
ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہیے

کہا ہے کس نے کہ غالبؔ برا نہیں لیکن

برای اسکی گرانتفتہ سری گمانی

دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے
کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے

بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں
مرحبا میں کیا مبارک ہے گراں جانی مجھے

کیوں نہ ہو بے التفاتی اس کی خاطر جمع ہے
جانتا ہے محوِ پرسش ہائے پنہانی مجھے

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

بدگماں ہوتا ہے وہ کافر نہ ہوتا کاش کے
اس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بستانی مجھے

وائے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا
لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے
تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری واہ واہ
پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزل خوانی مجھے

دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی
میرزا یوسف ہے غالبؔ یوسفِ ثانی مجھے

یاد ہے شادی میں بھی ہنگامۂ یا رب مجھے
سبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیرِ لب مجھے

ہے کشادِ خاطرِ وابستہ در رہنِ سخن
تھا طلسمِ قفلِ ابجد خانۂ مکتب مجھے

یا رب اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیے
رشک آسائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

نظمی مشتاق

صبح ہے مشتاق ہیں ... حسرت کیا کروں آرزو سے ہے شکست آرزو مطلب مجھے

دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے
عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر ہنوز اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی اسے یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمائش ہے

وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ غافل تھے شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے

رہے دل ہی میں تیر اچھا جگر کے پار ہو بہتر غرض شستِ بتِ ناوک فگن کی آزمائش ہے

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم تب دیکھیے کیا ہو ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے

وہ آویں گے مرے گھر وعدہ کیسا دیکھنا غالب

نئی بندش نہیں اب چرخ کہن کی آزمائش ہے

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

وہ بد خو اور میری داستانِ عشق طولانی
عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

ادھر وہ بدگمانی ہے ادھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے اس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

سنبھلنے دے مجھے اے ناتوانی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن
وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

ز بسکہ مشقِ تماشا جنوں علامت ہے
کشاد و بستِ مژہ سیلیِ ندامت ہے

نہ جانوں کیونکہ مٹے داغِ طعنِ بد عہدی
تجھے کہ آئنہ بھی ورطۂ ملامت ہے

بہ پیچ و تابِ ہوس سلکِ عافیت مت توڑ
نگاہِ عجز سرِ رشتۂ سلامت ہے

وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد
جنونِ ساختہ

جنون ساختۂ فصلِ گُل است ہی

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے
میرا ذمہ دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

کیا تعجب ہے کہ اس کو دیکھ کر آ جائے رحم
واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے

منہ نہ دکھلاوے نہ دکھلا پر بہ اندازِ عتاب
کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں
زلف گر بن جاؤں تو شانے میں الجھا دے مجھے

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

سچ کہتے ہو خودبین و خودآرا ہوں نہ کیوں ہوں
بیٹھا ہے بتِ آئنہ سیما مرے آگے

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا   کیونکر کہوں لو نام نہ ان کا مرے آگے

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر   کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام   مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے   آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو   آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے   رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا
غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے   تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے

نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ ہم ستمگر ہیں   مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیے

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جاوے   نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں   وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے

جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنیے   جو نا سزا کہے اس کو نہ نا سزا کہیے

ابھی جاری

کہیں حقیقتِ جاں کاہیِ مرض لکھیے
کہیں مصیبتِ ناسازیِ دوا کہیے

کبھی حکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجیے
کہیں حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے

رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجیے
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے

نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے
روانیِ روش و مستیِ ادا کہیے

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

صرفِ بہائے مے ہوئے آلاتِ مے کشی
تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم
بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر
پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

اس رنگ سے اٹھائی کل اس نے اسدؔ کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

نشہ ہا شادابِ رنگ و ساز ہا مستِ طرب — شیشۂ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے
ہم نشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست
واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

عرضِ نازِ شوخیِ دنداں برائے خندہ ہے — دعویٔ جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے
ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل — یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے
کلفتِ افسردگی کو عیشِ بے تابی حرام — ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے
سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

حسنِ بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے — آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے
تا کجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن
چشمِ وا گردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

[illegible]

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر
کب تک خیالِ طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

افسردگی نہیں طرب انشائے التفات
ہاں درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی

رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے
آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی

چاکِ جگر سے جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی
کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی

لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل
تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی

ناکامیِ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز
تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہرِ شکست
نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد یاس خیز
یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی

بیکاریِ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

چال جیسے کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے
غلام ساقی کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

تمہاری طرز و روش جانتے ہیں ہم کیا ہے
رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے

تحفۂ اہل قلم

سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

جوہرِ تیغ بہ سرچشمۂ دیگر معلوم
ہوں میں وہ سبزہ کہ زہراب اگاتا ہے مجھے

مدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے
آئنہ خانے میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے

نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک
آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے
دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

روندی ہوئی ہے کوکبۂ شہریار کے
اترائے کیوں نہ خاک سرِ رہگزار کے

جب اس کے دیکھنے کے لیے آئیں بادشاہ
لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کے

بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم ولے
کیونکر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کے

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہیگا اوسکی گردن پر	وہ خوں جو چشمِ تر سے عمر بھر یوں دمبدم نکلی

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن	بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچہ سے ہم نکلی

بھرم کھلجائے ظالم تیری قامت کی درازی کا	اگر اس طرۂ پرپیچ و خم کا پیچ و خم نکلی

مگر لکھوائے کوئی اوسکو خط تو ہم سے لکھوائے	ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھکر قلم نکلی

ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی	پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جامِ جم نکلی

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانیکی	وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلی

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنیکا	اوسیکو دیکھکر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلی

کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلی

کوہ کے ہوں بارِ خاطر گر صدا ہو جائیے	بے تکلف اے شرارِ جستہ کیا ہو جائیے

بیضہ آسا ننگِ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس	از سرِ نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے

مستی بذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے	موجِ شراب یک مژۂ خوابناک ہے

جز زخمِ تیغِ ناز

جز زخم تیغ ناز نہیں دل میں آرزو
جیب خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

جوش جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسد
صحرا ہماری آنکھ میں یک مشت خاک ہے

لب عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی
قیامت کشتۂ لعل بتاں کا خواب سنگیں ہے

آمد سیلاب طوفان صدائے آب ہے
نقش پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے

بزم مے وحشت کدہ ہے کس کی چشم مست کا
شیشے میں نبض پری پنہاں ہے موج بادہ سے

ہوں میں بھی تماشائی نیرنگ تمنا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

سیاہی جیسے گر جاوے دم تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

ہجوم نالہ حیرت عاجز عرض یک افغاں ہے
خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے

تکلف بر طرف ہے جانستاں تر لطف بد خویاں
نگاہ بے حجاب ناز تیغ تیز عریاں ہے

ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی
کہ صبحِ عید مجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہے

دل و دیں نقد لا، ساقی سے گر سودا کیا چاہے
کہ اس بازار میں ساغر متاعِ دستگرداں ہے

غم آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
چراغِ روشن اپنا قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

خموشی میں تماشا ادا نکلتی ہے
نگاہ دل سے تری سرمہ سا نکلتی ہے

فشارِ تنگیِ خلوت سے بنتی ہے شبنم
صبا جو غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے

نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ
کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے
نافہ دماغِ آہوئے دشتِ تتار ہے

کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا
آئینہ فرشِ شش جہتِ انتظار ہے

ہے ذرہ ذرہ تنگیِ جا سے غبارِ شوق
گر دام یہ ہے وسعتِ صحرا شکار ہے

دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ
نظارے کا مقدمہ پھر روبکار ہے

جھڑکی ہے شبنم آئینۂ برگِ گل پر آب
اے عندلیب وقتِ وداعِ بہار ہے

پچ آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

بے پردہ سوئے وادیِ مجنوں گزر نہ کر
ہر ذرے کے نقاب میں دل بے قرار ہے

اے عندلیب یک کفِ خس بہرِ آشیاں
طوفانِ آمدِ آمدِ فصلِ بہار ہے

دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی
اے بے دماغ آئینہ تمثال دار ہے

غفلت کفیلِ عمر و اسدؔ ضامنِ نشاط
اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں
گلدستۂ نگاہ سویدا کہیں جسے

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
افسونِ انتظار تمنا کہیں جسے

سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے
وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں
شوقِ عناں گسیختہ دریا کہیں جسے

درکار ہے شگفتنِ گل ہائے عیش کو
صبحِ بہار پنبۂ مینا کہیں جسے

غالب بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

شبنم بہ گلِ لالہ نہ خالی ز ادا ہے
داغِ دلِ بیدرد نظر گاہِ حیا ہے

دل خوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار
آئینہ بہ دستِ بتِ بدمستِ حنا ہے

شعلے سے نہ ہوتی ہوسِ شعلہ نے جو کی
جی کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے

تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق
آئینہ بہ اندازِ گل آغوش کشا ہے

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

خو نے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو
معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے

مجبوری و دعوائے گرفتاریِ الفت
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ
تیغِ ستم آئینۂ تصویر نما ہے

اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی
سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

[illegible]

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

بیگانگئ خلق سے بیدل نہ ہو غالب
کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا
گویا ابھی سنی نہیں آواز صور کی

آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج
اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں

حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام بہت ہے

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُرد تہ جام بہت ہے

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی
پاداش عمل کی طمع خام بہت ہے

ہیں اہل خرد کس روش خاص پہ نازاں
پابستگی رسم و رہ عام بہت ہے

زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوف حرم سے
آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے

ہے قہر گر اب بھی نہ بنے بات کہ ان کو
انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوش قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو — عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم — برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے

پھر گرم نالہ ہائے شرربار ہے نفس — مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق — سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں بخونِ دل — سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب — نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے — پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب — عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال — صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا — جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس — زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

اک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیر بار منت درباں کیے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوش اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

نوید امن ہے بیداد دوست جاں کے لیے
رہی نہ طرز ستم کوئی آسماں کے لیے

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگان خوں فشاں کے لیے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفت رشک
بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لیے

فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
دراز دستی قاتل کے امتحاں کے لیے

مثال یہ مری کوشش کی ہے

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

نصیرِ دولت و دیں اور معینِ ملت و ملک
بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لیے

زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرایش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

تمت تمام شد

تمام ہوئیں یہاں تک غزلیں دیوان غالب کی اب آگے قصاید اور قطعات

قصائد

ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بیکار
سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار

مستیٔ باد صبا سے ہے بعرض سبزہ
ریزۂ شیشۂ مے جوہر تیغ کہسار

سبز ہے جام زمرد کی طرح داغ پلنگ
تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت روئے شرار

مستیٔ ابر سے گلچین طرب ہے حسرت
کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار

کوہ و صحرا ہمہ معموریٔ شوق بلبل
راہ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار

سونپے ہے فیض ہوا صورت مژگان یتیم
سرنوشت دو جہاں ابر بیک سطر غبار

کاٹ کر پھینکیے ناخن تو بہ انداز ہلال
قوت نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بیکار

کف ہر خاک بہ گردوں شدہ قمری پرواز
دام ہر کاغذ آتش زدہ طاؤس شکار

مے کدے میں ہو اگر آرزوئے گلچینی
بھول جا یک قدح بادہ بہ طاق گلزار

موج گل ڈھونڈھ بہ خلوت کدۂ غنچۂ باغ
گم کرے گوشۂ مے خانہ میں گر تو دستار

کھینچے گر مانی اندیشہ چمن کی تصویر
سبز مثل خط نوخیز ہو خط پرکار

لعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحت شاہ
طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

وہ شہنشاہ کہ جس کے پئے تعمیر سرا
چشم جبریل ہوئی قالب خشت دیوار

فلک العرش ہجوم خم دوش مزدور
رشتۂ فیض ازل ساز طناب معمار

سبزۂ نہ چمن و یک خط پشت لب بام
رفعت ہمت صد عارف و یک اوج حصار

واں کے خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پر کاہ
وہ رہے مروحۂ بال پری سے بیزار

خاک صحرائے نجف جوہر سیر عرفا
چشم نقش قدم آئینۂ بخت بیدار

ذرہ اس گرد کا خورشید کو آئینۂ ناز
گرد اس دشت کی امید کو احرام بہار

آفرینش کو ہے واں سے طلب مستی ناز
عرض خمیازۂ ایجاد ہے ہر موج غبار

مطلع ثانی

فیض سے تیرے ہے اے شمع شبستان بہار
دل پروانہ چراغاں پر بلبل گلزار

شکل طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز
ذوق میں جلوہ کے تیرے بہوائے دیدار

تیری اولاد کے غم سے ہے بروئے گردوں
سلک اختر میں مہ نو مژۂ گوہر بار

ہم عبادت کو ترا نقش قدم مہر نماز
ہم ریاضت کو ترے حوصلے سے استظہار

ہو چمن تیری نہاں زمزمۂ نعتِ نبی | جام سے تیری عیاں بادۂ جوشِ اسرار
جوہرِ دستِ دعا آئینہ یعنی تاثیر | یک طرف نازشِ مژگان و دگر سو غمِ خار
مردمک سے ہو عزا خانۂ اقبالِ نگاہ | خاکِ در کی تری جو چشم نہ ہو آئینہ دار
دشمنِ آلِ نبی کو بہ طرب خانۂ دہر | عرضِ خمیازۂ سیلاب ہو طاقِ دیوار

دیدہ تا دل اسدؔ آئینۂ یک پرتوِ شوق
فیضِ معنی سے خطِ ساغرِ راقم سرشار

قصیدہ

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں | ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں
بیدلیہاے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق | بیکسیہاے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں
ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم | لغو ہے آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں
نقشِ معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت | سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں
لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم | دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں
مثلِ مضمونِ وفا باد بدستِ تسلیم | صورتِ نقشِ قدم خاک بہ فرقِ تمکیں

عشق بی ربطی شیرازۂ اجزای حواس | وصل زنگار رخ آئینۂ حسن یقین
کوہکن گرسنہ مزدور طربگاہ رقیب | بیستون آئینۂ خواب گران شیرین
کسنی دیکھا نفس اہل وفا آتش خیز | کسنی پایا اثر نالۂ دلہای حزین
سامع زمزمۂ اہل جہاں ہوں لیکن | نہ سر و برگ ستایش نہ دماغ نفرین
کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ | یکقلم خارج آداب وقار تمکین
نقش لاحول لکھہ ای خامۂ ہذیان تحریر | یا علی عرض کر ای فطرت وسواس قرین
مظہر فیض خدا جان و دل ختم رسل | قبلۂ آل نبی کعبۂ ایجاد یقین
ہو وہ سرمایۂ ایجاد جہاں گرم خرام | ہر کف خاک ہی واں گردۂ تصویر زمین
جلوہ پرداز ہو نقش قدم اوسکا جسجا | وہ کف خاک ہی ناموس دو عالم کی امین
نسبت نام سی اوسکی ہی یہ رتبہ کہ رہی | ابدا پشت فلک خم شدۂ ناز زمین
فیض خلق اوسکا ہی شامل ہی کہ ہوتا ہی سدا | بوی گل سی نفس باد صبا عطر آگین
برش تیغ کا اوسکی ہی جہاں میں چرچا | قطع ہو جای نہ سر رشتۂ ایجاد کہین
کفر سوز اوسکا وہ جلوہ ہی کہ جس سی ٹوٹی | رنگ عاشق کی طرح رونق بتخانۂ چین

جانِ پناہا دل و جاں فیض رسانا شاہا
وصیِ ختمِ رسل تو ہے بہ فتوائے یقیں

جسمِ اطہر کو ترے دوشِ پیمبر منبر
نامِ نامی کو ترے ناصیۂ عرش نگیں

کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب
شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں

آستاں پر ہے ترے جوہرِ آئینۂ سنگ
رقمِ بندگیِ حضرتِ جبریلِ امیں

تیرے در کے لیے اسبابِ نثار آمادہ
خاکیوں کو جو خدا نے دیے جان و دل و دیں

تیری مدحت کے لیے ہیں دل و جاں کام و زباں
تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبیں

کس سے ہو سکتی ہے مداحیِ ممدوحِ خدا
کس سے ہو سکتی ہے آرائشِ فردوسِ بریں

جنسِ بازارِ معاصی اسد اللہ اسد
کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں

شوخیِ عرضِ مطالب میں ہے گستاخ طلب
ہے ترے حوصلۂ فضل پہ از بس کہ یقیں

دے دعا کو مری وہ مرتبۂ حسنِ قبول
کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمیں

غمِ شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز
کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں

طبع کو الفتِ دلدل میں یہ سرگرمیِ شوق
کہ جہاں تک چلے اس سے قدم اور مجھ سے جبیں

دلِ الفت نسب و سینۂ توحید فضا
نگہِ جلوہ پرست و نفسِ صدق گزیں

صرفِ اعدا اثرِ شعلہ و دودِ دوزخ
وقفِ احباب گل و سنبلِ فردوسِ بریں

قصیدہ

ہاں مہِ نو سنیں ہم اوسکا نام
جسکو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح
یہی انداز اور یہی اندام

بارے دو دن کہاں رہا غایب
بندہ عاجز ہے گردشِ ایام

اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا
آسمان نے بچھا رکھا تھا دام

مرحبا اے سرورِ خاصِ خواص
حبذا اے نشاطِ عامِ عوام

عذر میں تین دن نہ آنے کے
لیکے آیا ہے عید کا پیغام

اوسکو بھولا نہ چاہیے کہنا
صبح جو جائے اور آئے شام

ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا
تیرا آغاز اور ترا انجام

رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے
مجھکو سمجھا ہے کیا کہیں نمّام

جانتا ہوں کہ آج دنیا میں
ایک ہی ہے امید گاہِ انام

میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش
غالب اوسکا مگر نہیں ہے غلام

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو　　　تب کہا ہے بطرز استفہام

مہر تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ　　　قرب ہر روزہ بر سبیل دوام

تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا　　　جز بتقریب عید ماہ صیام

جانتا ہوں کہ اس کے فیض سے تو　　　پھر بنا چاہتا ہے ماہ تمام

ماہ بن ماہتاب بن میں کون　　　مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام

میرا اپنا جدا معاملہ ہے　　　اور کے لین دین سے کیا کام

ہے مجھے آرزوئے بخشش خاص　　　گر تجھے ہے امید رحمت عام

جو کہ بخشے گا تجھ کو فر فروغ　　　کیا نہ دے گا مجھے مے گلفام

جب کہ چودہ منازل فلکی　　　کر چکی قطع تیری تیزی گام

تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر　　　کوئے و مشکوئے و صحن و منظر و بام

دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز　　　اپنی صورت کا اک بلوریں جام

پھر غزل کی روش پہ چل نکلا　　　توسن طبع چاہتا تھا لگام

غزل

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام
تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام

مے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں
غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام

بوسہ کیسا یہی غنیمت ہے
کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دشنام

کعبہ میں جا بجائیں گے ناقوس
اب تو باندھا ہے دیر میں احرام

اس قدح کا ہے دور مجھ کو نقد
چرخ نے لی ہے جس سے گردشِ وام

بوسہ دینے میں اُن کو ہے انکار
دل کے لینے میں جن کو تھا ابرام

چھیڑتا ہوں کہ اُن کو غصہ آئے
کیوں رکھوں ورنہ غالب اپنا نام

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ
اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام

کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا
ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام

تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن
نامِ شاہنشہِ بلند مقام

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ
مظہرِ ذوالجلال والاکرام

شہسوارِ طریقۂ انصاف
نوبہارِ حدیقۂ اسلام

جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز ‏ ‏ جس کا ہر قول معنیِ الہام

بزم میں میزبانِ قیصر و جم ‏ ‏ رزم میں اوستادِ رستم و سام

ای ترا لطف زندگی افزا ‏ ‏ ای ترا عہد فرخی فرجام

چشمِ بد دور خسروانہ شکوہ ‏ ‏ لوحش اللہ عارفانہ کلام

جاں نثاروں میں تیری قیصرِ روم ‏ ‏ جرعہ خواروں میں تیری مرشدِ جام

وارثِ ملک جانتی ہیں تجھی ‏ ‏ ایرج و تور و خسرو و بہرام

زورِ بازو میں مانتی ہیں تجھی ‏ ‏ گیو و گودرز و بیژن و رہّام

مرحبا موشگافیِ ناوک ‏ ‏ آفریں آبداریِ صمصام

تیر کو تیری تیرِ غیر ہدف ‏ ‏ تیغ کو تیری تیغِ خصم نیام

رعد کا کر رہی ہی کیا دم بند ‏ ‏ برق کو دی رہی ہی کیا الزام

تیری فیلِ گراں جسد کی صدا ‏ ‏ تیری رخشِ سبک عناں کا خرام

فنِ صورت گری میں تیرا گرز ‏ ‏ گر نہ رکھتا ہو دستگاہِ تمام

[illegible]

اوسکی مغروب کی سرو تن سی — کیون نمایاں ہو صورت اوشام

جب ازل میں رقم پذیر ہوئی — صفحہ ہای لیالی و ایام

اور اوراق میں لکھا قضا — مجملا مندرج ہوئی احکام

لکھدیا شاہد و نکو عاشق — لکھدیا عاشقوں کو دشمن کام

آسمان کو کہا گیا کہ کہیں — گنبد تیز گرد نیلی فام

حکم ناحق کہا گیا کہ لکھیں — خال کو دانہ اور زلف کو دام

آتش و آب و باد و خاک کی — وضع سوز و نم و رم و آرام

مہر رخشاں کا نام خسرو روز — ماہ تاباں کا اسم شحنۂ شام

تیری توقیع سلطنت کو بھی — دی بدستور صورت ارقام

کاتب حکم نی بموجب حکم — اوس رقم کو دیا طراز دوام

ہوئی ازل سی رواتی آغاز
ہو ابد تک رسائی انجام

تمام شد

قصیدہ سوم

صبح دم دروازۂ خاور کھلا
مہرِ عالم تاب کا منظر کھلا

خسروِ انجم کے آیا صرف میں
شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا

وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود
صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا

سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو
موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا

صبح آیا جانبِ مشرق نظر
اک نگارِ آتشیں رخ سر کھلا

تھی نظر بندی کیا جب ردِّ سحر
بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا

لا کے ساقی نے صبوحی کے لیے
رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا

بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ
کعبۂ امن و اماں کا در کھلا

تاجِ زریں مہرِ تاباں سے سوا
خسروِ آفاق کے منہ پر کھلا

شاہِ روشن دل بہادر شہ کہ ہے
رازِ ہستی اس پہ سر تا سر کھلا

وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں
مقصدِ نہ چرخ و ہفت اختر کھلا

ہم کو بھی اس رازداری پر گھمنڈ — دوست کا ہے راز دشمن پر کھلا

واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ — زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا

ہاتھ سے رکھ دی کب ابرو نے کمان — کب کمر سے غمزے کی خنجر کھلا

مفت کا کس کو برا ہے بدرقہ — رہروی میں پردۂ رہبر کھلا

سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک — آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھلا

نامے کے ساتھ آ گیا پیغامِ مرگ — رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

دیکھیو غالب سے گر الجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال — پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا

خامے نے پائی طبیعت سے مدد — بادباں بھی اٹھتے ہی لنگر کھلا

مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ — یاں عرض سے رتبۂ جوہر کھلا

مہر کانپا چرخ چکر کھا گیا — بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا

بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب — اب علوِ پایۂ منبر کھلا

سکہ شہ کا ہوا ہے

سکہ شہ کا ہوا ہی روشناس — اب عیار آبروئی زر کہلا

شاہ کی آگی دہرا ہی آئینہ — اب مآل سعی اسکندر کہلا

ملک کی وارث کو دیکہا خلق نی — اب فریب طغرل و سنجر کہلا

ہو سکی کیا مدح ہاں اک نام ہی — دفتر مدح جہان داور کہلا

فکر اچہی پر ستائش نا تمام — عجز اعجاز ستائش گر کہلا

جانتا ہوں ہی خط لوح ازل — تم پہ ای خاقان نام آور کہلا

تم کرو صاحب قرانی جب تلک
ہی طلسم روز و شب کا در کہلا

در وصف انبہ

ہاں دل دردمند زمزمہ ساز — کیوں نہ کہولی در خزینہ راز

خامہ کا صفحہ پر روان ہونا — شاخ گل کا ہی گلفشان ہونا

مجہ سی کیا پوچہتا ہی کیا لکہئی — نکتہ ہای خرد فزا لکہئی

بارى آموں کا کچہ بیان ہو جای — خامہ نخل رطب فشان ہو جای

آم کا کون مرد میدان ہے
ثمر و شاخ گوی و چوگان ہے

تاک کے جی میں کیوں رہے ارمان
آئے یہ گوی اور یہ میدان

آم کے آگے پیش جاوے خاک
پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک

نہ چلا جب کسی طرح مقدور
بادۂ ناب بن گیا انگور

یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے
شرم سے پانی پانی ہونا ہے

مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے
آم کے آگے نیشکر کیا ہے

نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ نہ بار
جب خزاں آئے تب ہو اس کی بہار

اور دوڑائیے قیاس کہاں
جان شیریں میں یہ مٹھاس کہاں

جان میں ہوتی گر یہ شیرینی
کوہکن باوجود غمگینی

جان دینے میں اس کو یکتا جان
پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان

نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر
کہ دواخانۂ ازل میں مگر

آتش گل پہ قند کا ہے قوام
شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام

بالمری القلم قمر زرین

یا بہ مو گماں کہ فرح رافت سی ۔ یا شہ الحقی تاج محبت سی

انگبیں کی بحکم رب الناس ۔ بہر کی بہجی ہیں سر تمبر گھار گس

یا لگا کر خضر لی شاخ نبات ۔ ہد ترن تک دیا ہی آب حیات

تب اہی ثمر فشاں بیہ نخل ۔ ہم کہاں جوزہ اور کہاں بیہ نخل

تیا ترنج زرد اک خسرو پاس ۔ رنگ کا زرد بر کہاں پر پاس ہا ہا

آم تو دیکھتا اگر اک بار ۔ بہنلہ بتا طلاری دست فشار

رونق کار گاہ برگ و نوا ۔ نارش دو دمان آب و ہوا

رہبر و راہ خلد کا توشہ ۔ طرفی رسد رہ کا جگر گوشہ

صاحب شاخ و برگ و بار ہی آم ۔ نار پروردۂ بہار ہی آم

خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو ۔ نوبر نخل باغ سلطاں ہو

وہ کہ ہی والی ولایت عہد ۔ سلسل نسبی او کی ہی حمایت عہد

مخزن عز و شان و جاہ و جلال ۔ زینت صنعت جمال و کمال

کار فرمای دین و دولت و بخت ۔ چہرہ آرای تاج و مسند و تخت

سایہ او سکا ہما کا سا سایہ ہی ۔ خلق پروردہ خدا کا سایہ ہی

ای مفیض وجود سایہ و نور ۔ جب تلک ہی نمود سایہ و نور

اس خداوندِ بندہ پرور کو
وارثِ گنج و تخت و افسر کو

شاد و دلشاد و شادماں رکھیو
اور غالب پہ مہرباں رکھیو

قطعات

اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر
اے جہاندارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل

پاؤں سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ
فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکلیل

تیرا اندازِ سخن شانۂ زلفِ الہام
تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل

تجھ سے عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیم
تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل

بہ سخن اوج دہِ مرتبۂ معنی و لفظ
بہ کرم داغ نہِ ناصیۂ قلزم و نیل

تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر
تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل

ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر
زہرہ نے ترک کیا حوت سے جانا تحویل

تیری دانش مری اصلاحِ مفاسد کی رہین
تیری بخشش مرے انجاحِ مقاصد کی کفیل

تیرا اقبالِ ترحم مرے جینے کی نوید
تیرا اندازِ تغافل مرے مرنے کی دلیل

بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں
چرخِ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل

پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ
پہلے ٹھونکی ہے بنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

نپٹ مشکل ہیں بیاں الف حرف عظیم
کہ نہیں دم ہیں پی جا لفظ جبر ثقیل

دور مٹی سی مرا صفحہ لقا کی دور رہی
غم لیتی سی مرا سینہ امر کی زنبیل

فکر میری گہر اندوز اشارات کثیر
کلک میری رقم آموز عبارات قلیل

میری ابہام پہ ہوتی ہی تصدق توضیح
میری اجمال سی کرتی ہی تراوش تفصیل

نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف
جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل

قبلہ کون و مکاں خستہ نوازی میں یہ دیر
کعبہ امن و اماں عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

قطعہ

گئی وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری
کیا کرتی تھی تم تقریر ہم خاموش رہتی تھی

بس اب بگڑی پہ کیا شرمندگی جانی دو ملنی دو
قسم لو ہم سی گر یہ بھی کہیں کیوں ہم نہ کہتی تھی

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نی ہمنشیں
اک تیر میری سینہ میں مارا کہ ہائی ہائی

وہ سبزہ زار ہائی مطرا کہ ہی غضب
وہ نازنیں بتان خود آرا کہ ہائی ہائی

صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت ربا وہ ان کا اشارا کہ ہائی ہائی

وہ میوہ ہائی تازہ و شیریں کہ واہ واہ

وہ بادہ ہائے نابِ گوارا کہ ہائے ہائے

در مدحِ ڈلی

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

مہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے
حرزِ بازوئے شگرفانِ خود آرا کہیے

مسی آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں لکھیے
داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے

خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیے
سرِ پستانِ پریزاد سے مانا کہیے

اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے
خالِ مشکینِ رخِ دلکشِ لیلیٰ کہیے

حجر الاسودِ دیوارِ حرم کیجے فرض
نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہیے

وضع میں اس کو اگر سمجھیے قافِ تریاق
رنگ میں سبزۂ نوخیزِ مسیحا کہیے

صومعے میں اسے ٹھہرائیے گر مہرِ نماز
میکدے میں اسے خشتِ خمِ صہبا کہیے

کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے
کیوں اسے نقطۂ پرکارِ تمنا کہیے

کیوں اسے گوہرِ نایاب تصور کیجے
کیوں اسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہیے

کیوں اسے تکمۂ پیراہنِ لیلیٰ لکھیے
کیوں اسے نقشِ پئے ناقۂ سلمیٰ کہیے

بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجے فرض

اور اس چکنی

اور اس ٹکی ساری کو سو بار کہتی

قطعہ

نہ پوچھ اسکی حقیقت حضور والا نے
مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی

نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر
جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی

بیان مصنف

منظور ہے گذارش احوال واقعی
اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

استاد شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

جام جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون اور ریختہ ہاں اس سے مدعا
جز انبساط خاطر حضرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا ز رہ امتثال امر
دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے

قسمت بری سہی پہ طبیعت بری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالبؔ خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

مدح

نصرت الملک بہادر مجھے بتلا کہ مجھے
تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے

گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے
رونق بزم مہ و مہر تری ذات سے ہے

اور میں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں
غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے

خستگی کا ہو بھلا جس کے سبب سے سر دست
نسبت اک گونہ مرے دل کو ترے ہات سے ہے

ہاتھ میں تیرے رہے توسن دولت کی عناں
یہ دعا شام و سحر قاضی حاجات سے ہے

تو سکندر ہے مرا فخر ہے ملنا تیرا
گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

اس پہ گزرے نہ گماں ریو و ریا کا زنہار
غالبؔ خاک نشیں اہل خرابات سے ہے

متفرقات

ہے چار شنبہ آخر ماہ صفر چلو
رکھ دیں چمن میں بھر کے مئے مشک بو کی ناند

جو آئے

جو آئے جام بھر کے پیے اور ہو کے مست
سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند

غالبؔ یہ کیا بیاں ہے بجز مدحِ بادشاہ
بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشتِ خواند

بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلے حضور میں
ہے جن کے آگے سیم و زر و مہر و ماہ ماند

یوں سمجھیے کہ بیچ سے خالی کیے ہوئے
لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند

در مدحِ شاہ

اے شاہِ جہانگیر جہاں بخش جہاں دار
ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت

جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو
تو وا کرے اس عقدے کو سو بھی باشارت

ممکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر
گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت

آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا
ہے فخر سلیمان جو کرے تیری وزارت

ہے نقش مریدی ترا فرمانِ الٰہی
ہے داغِ غلامی ترا توقیعِ امارت

تو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلاں
تو آگ سے گر دفع کرے تابِ شرارت

ڈھونڈے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی
باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت

ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغّل ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت
کیوں کر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر قاصر ہے ستائش میں تری میری عبارت
نو روز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں نظّارگیِ صنعتِ حق اہلِ بصارت
تجھ کو شرفِ مہرِ جہاں تاب مبارک
غالب کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

قطعہ

افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

گزارشِ مصنف بحضورِ شاہ

اے شہنشاہِ آسمان اورنگ اے جہاندارِ آفتاب آثار
تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشیں تھا میں اک دردمندِ سینہ فگار
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی ہوئی میری وہ گرمیِ بازار
کہ ہوا مجھ سا ذرّۂ ناچیز روشناسِ ثوابت و سیّار
گرچہ از روئے ننگِ بے ہنری ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہوں لیکن

شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں — بادشہ کا غلام کار گزار

خانہ زاد اور مرید اور مداح — تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر — نسبتیں ہو گئیں مشخص چار

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں — مدعائے ضروری الاظہار

پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں — ذوق آرائش سر و دستار

کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر — تا نہ دے باد زمہریر آزار

کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش — جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار

کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال — کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار

رات کو آگ اور دن کو دھوپ — بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار

آگ تاپے کہاں تلک انسان — دھوپ کھاوے کہاں تلک جاندار

دھوپ کی تابش آگ کی گرمی — وقنا ربنا عذاب النار

میری تنخواہ جو مقرر ہے — اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار

رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک — خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

مجھ کو دیکھو تو ہوں بقید حیات — اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض | اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا | ہو گیا ہے شریک ساہو کار
آج مجھ سا نہیں زمانہ میں | شاعرِ نغز گوی خوش گفتار
رزم کی داستان گر سنیے | ہے زباں میری تیغ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجے | ہے قلم میری ابرِ گوہر بار
ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد | قہر ہے گر کرو نہ مجھکو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا | آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار
میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ | تا نہ ہو مجھکو زندگی دشوار
ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام | شاعری سے نہیں مجھے سروکار

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

قطعات

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے | جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے | کہ جو شریک ہو میرا شریکِ غالب ہے

نظم (۱)

قطعۂ تاریخ

خجستہ انجمنِ طوئ میرزا جعفر
کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محظوظ
ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں غالبؔ
نہ کیوں ہو مادۂ سالِ عیسوی "محظوظ"
۱۸۵۴ء

قطعۂ تاریخ

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی
ہوا بزمِ طرب میں رقصِ ناہید
کہا غالبؔ سے تاریخ اس کی کیا ہے
تو بولا "انشراحِ جشنِ جمشید"

قطعہ

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں
دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں
کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام
اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

رباعیات

بعد از اتمامِ بزمِ عیدِ اطفال
ایامِ جوانی رہے ساغر کشِ حال
آپہنچے ہیں تا سوادِ اقلیمِ عدم
اے عمرِ گزشتہ یک قدم استقبال

ایضاً

شب زلف و رخِ عرق فشاں کا غم تھا
کیا شرح کروں کہ طرفہ تر عالم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک
ہر قطرۂ اشک دیدۂ پرنم تھا

ایضاً

آتش بازی ہے جیسے شغل اطفال ہے سوز جگر کا بھی اسی طور کا حال
تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی لڑکوں کے لیے گیا ہے کھیل نکال

ایضاً

دل تھا کہ جو جانِ دردِ تمہید سہی بیتابیِ رشک و حسرتِ دید سہی
ہم اور فسردن اے تجلی افسوس تکرار روا نہیں تو تجدید سہی

ایضاً

ہے خلق حسد قماش لڑنے کے لیے وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لیے
یعنی ہر بار صورتِ کاغذ باد ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لیے

ایضاً

دل سخت نژند ہو گیا ہے گویا اس سے گلہ مند ہو گیا ہے گویا
پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں غالب منہ بند ہو گیا ہے گویا

ایضاً

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالب دل رک رک کر بند ہو گیا ہے غالب
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں سونا سوگند ہو گیا ہے غالب

ایضاً

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

قطعہ تاریخ

یہ بھی ہے جو ملک شاہ جم جاہ کے دال
ہے لطف و عنایات شہنشاہ پہ دال

یہ شاہ بلند اقبال کی بحث و جدال
ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

ایضاً

ہیں نسخہ میں صفات ذوالجلالی باسم
زنار جلال کی رہا ہے باسم

ہوں شاد نہ کیوں ساحل عالی باسم
ہے اب کی کتب قدر و والی باسم

ایضاً

ہے نسخہ کی لقا سے خلق کو شاد کرے
تا شاہ شیخ دانش و داد کرے

یہ وہی جو گنتی ہے رشتہ عمر میں گھٹا ہے
ہے صفر کہ افزائش اعداد کرے

ایضاً

اس رشتہ میں لکھتا رہوں ملک سوا
اتنے ہی برس شمار رہوں ملک سوا

ہر سنبلہ کہ ایک سو بیس ہیں عرض تین
ایسی گرہیں ہزار ہوں ملک سوا

ایضاً

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں
عشاق کی پرسش سے اسے عار نہیں

جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہوگا
کیونکر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

ایضاً

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے
کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے

صاحب اهم ف بپاس ملاحظه جناب موصوف صحتی
و در مطبع بسیا کهه نشدنی پور نمانتی سمت ۱۹۲۶ مطابق سنه ۱۸۶۹
تاریخ ۲۵ ماه مئی عیسوی و تاریخ ۱۳ ماه صفر سنه ۱۲۸۶ هجری
روز سه‌شنبه بوقت شش گهری روز برآمده صورت
اختتام پذیرفت امیدوار از صاحبان ملاحظه ام
که اگر خطائی رفته باشد از راه عطا عفو فرمایند

کتابیات

دیوانِ غالب مفتی محمد انوار الحق لکھنؤ ۱۹۸۲

دیوانِ غالب نسخۂ حمیدیہ حمید احمد خاں، لاہور ۱۹۹۲ء

دیوانِ غالب مرقعِ چغتائی عبدالرحمٰن چغتائی لاہور ۱۹۲۸ء

دیوانِ غالب نسخۂ عرشی لاہور ۱۹۹۲

کلیاتِ غالب فارسی مرتبہ امیر حسن نورانی لکھنؤ ۱۹۶۸ء

FOREWORD

I take great pleasure in informing that the National Mission for Manuscripts has published a facsimile edition of a rare manuscript of the very famous Urdu and Persian poet, Mirza Asadullah Khan Ghalib who died in 1869 AD at Delhi. Ghalib's legacy has an important place in the literary heritage of our country. His poetry is a source of inspiration of Indian society and culture which has been narrated in this Diwan quite forcefully.

The Mission is thankful to Prof. Abdul Haq, who is a very respected scholar of Urdu literature and is known for the visionary study of Iqbal and other classical Urdu manuscripts, for taking up the project and for his untiring efforts in publishing the work. The National Mission for Manuscripts is committed to restoring and publishing the rare manuscripts of Indian languages. So far, no manuscript of Diwan-e-Ghalib has been published containing the original style of his writing.

We hope that the lovers of literatures and scholars of Ghalib and Urdu poetry will welcome this rare edition of Diwan-e-Ghalib with great interest.

Prof. Pratapanand. Jha
Director
National Mission for Manuscripts

Introduction

Ghalib and Iqbal are the best known and the most popular poets of Urdu. Both are bilingual and their Persian poetry is much more rich in comparison to Urdu but their fame rests on Urdu. Iqbal is unparalleled due to his sublime philosophical thought and revealed ideas in a refined creative expression. Ghalib composed a small Diwan in Urdu which contains less than two thousand couplets and was published five times in his life. Many changes were made by Ghalib in the text in same editions. Minor variations have occurred because of different editions. Scholars have brought the edited text of his Diwan. It is strange that no copy of manuscript, written by Ghalib or by his contemporary is presently available. The manuscript in my hand has a significant value and importance. It was calligraphed three months after death of Ghalib. It has been calligraphed by Manohar Lal, son of Shiv Lal and it was presented to Saheb Ramji a landlord of Hindon, Ghaziabad.

The manuscript has a rare literary significance as an authenticated copy of Diwan of poet's age. The style of writing of that period is preserved in the manuscript. The presentation of writing of that time compelled me to publish it in its original form without any emendation or change. I am happy that the National Mission for Manuscripts agreed to my request. I express my thanks to Shri Ram Bahadur Rai, the President, IGNCA, Professor Pratapanand Jha, Director, N.M.M and Dr. Sanghamitra Basu for their courteous cooperation.

Dr. Abdul Haq
Professor Emirates
Delhi University, Delhi

DIWAN-E-GHALIB

(Facsimile edition of rare manuscript)

Editor

Abdul Haq

Published by

National Mission for Manuscripts, New Delhi

Asila Offset Printers, New Delhi

PRAKASHIKA

Number 53

General Editor

Pratapanand Jha

DIWAN-E-GHALIB

The experiences and knowledge from our past are recorded in manuscripts which have been handed down to us over several thousand years. The Government of India, through the Department of Culture, took note of the importance of the vast tangible heritage and established the National Mission for Manuscripts. In order to disseminate the knowledge content of manuscripts, the Mission has taken up several programmes such as lectures, seminars and workshop. The Mission publishes the proceedings of the above-said programmes under the following series: Samrakshika (on conservation), Tattavabodha (papers of Tattavabodha lectures), Samikshika (seminar papers), and Kritibodha (transcribed and edited text prepared during advance level manuscriptology workshops conducted by the Mission) Moreover the National Mission for Manuscripts has taken up a project under Prakashika series for publishing rare and unpublished manuscripts in three formats-(1) Facsimile, (b) Critical edition and (c) Critical edition with translation.

The present manuscript, Diwan-e-Ghalib is getting published by the National Mission for Manuscripts under its Prakashika series.

About the Book

This is the most rare and valuable manuscript of Diwan-e-Ghalib, which was calligraphed just after the death of Mirza Asadullah Khan Ghalib, who is a celebrated poet of the century. Since there is no manuscript written by Ghalib is available so far, hencethis manuscript in handhas significant importance. It contains the style of writing of his time, which has been preserved in this facsimile edition.

प्रकाशिका - ५३

Prakashika - 53

DIWAN-E-GHALIB

Editor:

Abdul Haq